حیات و کائنات

رام کرشن مضطر

(مطبوعہ تیج پریس نیا بازار دہلی)

بارِ اوّل ایک ہزار

مارچ ۱۹۵۳ء

پرنٹر و پبلشر منیجر تیج پریس نیا بازار دہلی

ملنے کے پتے

۱۔ منیجر تیج پریس نیا بازار دہلی
۲ کتب خانہ عزیزیہ اردو بازار جامع مسجد دہلی
۳۔ رام کرشن مضطر۔ روزانہ ملاپ نئی دہلی

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

غالبؔ

ہدیۂ تشکر

شری رنبیر جی پروپرائٹر روزانہ "ملاپ" کی محبت اور چوہدری گوری شنکر سگر ایڈیٹر "ملاپ" کی شفقت کا احسان مند ہوں جنہوں نے میری زندگی کو سہارا دیا ہے اور جو ہر قدم پر میری رہنمائی فرما رہے ہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی سردار دیوان سنگھ ایڈیٹر "ریاست" شری سندر شیام پرویز جناب نریش کمار شاد شری نریندر کمار مہرا۔ شری جمنا داس اختر۔ پنڈت میلا رام ماہر جناب پی۔ این کشمیری جناب دیا شنکر نظر جناب سودیش کمار ہستی جناب کرشن اثر جناب ہری چند رند جناب جگن ناتھ آزاد۔ شری رام لال طائر اور جناب مہیش چند نقش کی مسلسل نوازشوں کا ممنون ہوں۔

آخر میں انتہائی خلوص و محبت سے اپنے مکرم دوست اور محسن شری لالہ دھرم پال گپت "وفا" ایڈیٹر "تیج" دہلی کے لطف خاص کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے حسن التفات سے میری نظموں کا یہ مجموعہ منظر عام پر آیا

مضطر

پیش لفظ

از حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی

مضطرؔ صاحب کا کلام میں نے جا بجا سے پڑھا، جس سے اندازہ ہوا کہ وہ جس مقام سے شعر کہتے ہیں، اُس مقام کو پہچان اور اُس کے تیور سمجھ کر کہتے ہیں۔

اُن کی طبیعت میں روانی، حرارت اور حدّت پائی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ زندگی کے اُن گوشوں پر بھی ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہیں جن پر عام شعراء کی نظر نہیں جاتی

ذہانت، و ذکاوت کے دوش بدوش اُن میں حساسیت و اخاذی کا مادّہ بھی پایا جاتا ہے۔

اُن کا حافظہ اس قدر تیز ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنا ہی نہیں، دوسروں کا کلام اس کثرت اور اس روانی کے ساتھ سُناتے ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے

ہمارے عام شاعروں میں فریاد و فغاں اور گور و کفن کی بہتات ہے اور وہ زندگی بھر موت موت پکارتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس مضطرؔ صاحب کے وہاں نشاط و کیف اور حیات کے چمن کے چمن لگے ہوئے ہیں اور ان کا کلام پڑھ کر زندگی و سرخوشی محسوس ہوتی ہے

وہ ابھی جواں سال اور نومشق ہیں لیکن اُن کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ پختگی کی عمر تک پہونچ کر کیا سے کیا ہو جائیں گے ÷

جوشؔ

دہلی ۲۔ مارچ ۱۹۵۳ء

نغمۂ حیات

ہمنفس! ہے میرے دم سے گرمیٔ بزمِ حیات
رقص فرما ہے مرے نغموں میں روحِ کائنات
میری تخلیقات میں رنگِ حیاتِ تازہ ہے
میرا فن روئے نشاطِ زندگی کا غازہ ہے
جذبۂ بیدار ہے افکار و احساسات میں
کروٹیں لیتی ہے دنیا میرے امکانات میں
پھوٹتے ہیں آتشیں نغمات میرے ساز سے
برف کے تودے پگھلتے ہیں مری آواز سے

فکر کو ذوقِ جواں سے زندگی دیتا ہوں میں
زندگی، رخشندگی، پائندگی دیتا ہوں میں
میرے دِل میں ولولے ہیں میرے سینے میں اُمنگ
جوش سے پایا ہے میری شاعری نے آب و رنگ
یہ مری شعلہ نوائی ہے بیانِ زیست میں
میرے گیتوں سے چراغاں ہے جہانِ زیست میں
جلوۂ اُمید سے روشن کئے ہیں دل کے داغ
غمکدے میں آرزوؤں کے جلائے ہیں چراغ
قافلوں پر وا کئے جادہ و منزل کے راز
وہ حُدی خواں ہوں میں جس کی ہر صدا ہے دِل نواز
ذہن پر طالع کیا ہے آفتابِ آگہی
میں نے بخشی ہے جبینِ عقل کو تابندگی

آنسوؤں سے میرے روشن ہے شبستانِ وجود
مُسکراہٹ سے مری کھُلتا ہے رازِ ہستی و بُود

پھُول میرے سینۂ صد چاک کا آئینہ ہے
حُسن میرے عالمِ اِدراک کا آئینہ ہے

مادیّت کی حقیقت پر یقیں رکھتا ہُوں میں
آدمی کے عزم و قوّت پر یقیں رکھتا ہُوں میں

آدمی کے قبضۂ قدرت سے باہر کچھ نہیں
عرش بھی ہے آج اہلِ فرش کے زیرِ نگیں

مارچ ۱۹۵۲ء

اندازِ سخن

تقاضائے گل و سرو و سمن کچھ اور ہے ساقی
مگر منظورِ اربابِ چمن کچھ اور ہے ساقی

ہوا ہے اب سے پہلے بھی تغیّر بارہا، لیکن
یہ رنگِ انقلاباتِ چمن کچھ اور ہے ساقی

شہنشاہوں کے ایوانوں کی بنیادیں ہلا ڈالیں
ترے رندوں کا یہ دیوانہ پن کچھ اور ہے ساقی

کہاں وہ نشّہ و کیف و اثر اس بادۂ نو میں
ترے شیشے کی صہبائے کہن کچھ اور ہے ساقی

ہزاروں رنگِ خوبانِ جہاں کے ہم نے دیکھے ہیں
ترے ناز و ادا کا بانکپن کچھ اور ہے ساقی

جمالِ شاہدِ ایماں فسوں ساماں سہی لیکن
ترا یہ غمزۂ تقویٰ شکن کچھ اور ہے ساقی

نہیں یہ زندگی تسنیم و کوثر کی فضاؤں میں
بہارِ وادیٔ گنگ و جمن کچھ اور ہے ساقی

ستم کا کیا گلہ طرزِ تغافل کی شکایت کیا
کہ اب تیری روش تیرا چلن کچھ اور ہے ساقی

بجا ہے مسکرانا بھی ہم اہلِ درد کو لازم
مگر اب تو مذاقِ انجمن کچھ اور ہے ساقی

مذاہب کے امیں، عہد آفریں رازوں کو کیا سمجھیں
پیامِ عازمِ دار و رسن کچھ اور ہے ساقی

خُدا و جبرئیل و عرش سے کیا واسطہ اَپنا
زمیں والوں کا اَندازِ سخن کچھ اور ہے ساقی

۱۹۵۲ء

●

حیاتِ جاوداں بھی اور مرگِ ناگہاں بھی ہے
مرا احساسِ غم یارب یقیں بھی ہے گماں بھی ہے
دلوں کا سوز بھی ہے اور نگاہوں کی زباں بھی ہے
محبت زندگی ہے زندگی کی ترجماں بھی ہے
ندائے رہنما بھی ہے درائے کارواں بھی ہے
یہی تو سلسلہ جنبانیٔ عزمِ جواں بھی ہے
گدازِ جسم و جاں ہے امتزاجِ شعلہ و شبنم
ہیں جس کی آنکھ میں آنسو وہی آتش بجاں بھی ہے

نگاہیں بھی تو آہوں کی طرح محسوس ہوتی ہیں
یہ راز آخر کھلا مجھ پر خموشی ہی فغاں بھی ہے

بہر پہلو سمجھ کر بھی سمجھ میں کچھ نہیں آتا؟
محبت راز ہے ایسا عیاں بھی ہے نہاں بھی ہے

محبت کس کو کہتے ہیں انہیں اب کون سمجھائے
کہ یہ اک لفظ بھی ہے داستاں در داستاں بھی ہے

ترے لطف و کرم پر تو مجھے کچھ شک نہیں لیکن
تری نظریں یہ کہتی ہیں کہ تو کچھ بدگماں بھی ہے

بس اب اہلِ وفا کی زندگی کا فیصلہ ہوگا
تمہاری آزمائش ہے ہمارا امتحاں بھی ہے

عجب عالم ہے دنیا کا کہ زنداں بھی ہے در گھر بھی
یہ کیا طرفہ قیامت ہے قفس ہی آشیاں بھی ہے

نئے انساں نے یزداں کے تصور کو بدل ڈالا
زمیں کا ہی تغیر انقلابِ آسماں بھی ہے

غمِ محرومیٔ عشرت ہے اب اک مستقل عالم
خزاں ہی آئینہ دارِ بہارِ بے خزاں بھی ہے

اگر معمورِ دردِ آرزوئے دوست ہے تو کیا!
کہ اس دل میں ابھی گنجائش کون و مکاں بھی ہے

ہزار الطاف ہیں پنہاں اک اندازِ تغافل میں
بطرزِ خاص وہ نامہرباں ہی مہرباں بھی ہے

مزاجِ حسن پر شدت سے تنقیدیں نہ کر ناداں
ذرا برہم نگاہِ آشنائے رازداں بھی ہے

کہاں بدلے ہیں آئینِ نظامِ میکدہ ساقی!
ابھی تیری نظر کو امتیازِ این و آں بھی ہے

زہے قسمت اگر وہ التفاتِ خاص فرمائیں
وگرنہ عرضِ غم اک التجائے رائیگاں بھی ہے

کفِ صحرا و دامانِ بیاباں ہی نہیں ہمدم!
ہمارے خون سے رنگیں جبینِ گلستاں بھی ہے

ہنسی بے ساختہ آئے نہ کیوں اس دل کی حالت پر
کہ مایوسِ بیاں ہے اور مجبورِ بیاں بھی ہے

شبستانِ اَلم میں روشنی ہے میرے اشکوں سے
دلِ زارِ محبت شمعِ محرابِ جہاں بھی ہے

غمِ دنیا سے کوسوں دور تھے مضطرؔ مگر اب تو
غمِ دنیا بھی ہے اندیشۂ سود و زیاں بھی ہے

۱۹۵۲ء

ہزار شکر کہ ہوں محرمِ بہار ہنوز
چمن فروش و گہر ریز و نغمہ بار ہنوز

جوشؔ

رقص و رنگ

ہر الم مسرور ہے اور ہر خوشی رقصاں ہے آج
زندگی رقصاں ہے بزمِ زندگی رقصاں ہے آج
مشرقِ اُمید سے پھوٹی شعاعِ صبحِ نو
آفتابِ زیست کی رخشندگی رقصاں ہے آج
پھول برساتی ہے ہنس ہنس کر عروسِ کائنات
سُرخ آنچل میں شبابِ زندگی رقصاں ہے آج

حُسن کی رنگینیوں میں مُسکراتی ہے حیات
عشق کی محفل میں کیفِ بیخودی رقصاں ہے آج
سحر آگیں انکھڑیوں کی یہ اَدائے اِلتفات
ہر اِشارے پر جہانِ زندگی رقصاں ہے آج
یہ جبینِ ناز کی شبنم یہ رُخساروں کی آگ
حُسنِ ماہ و مہر کی تابندگی رقصاں ہے آج
یہ نگاہوں کا سَلوناپن یہ ہونٹوں کی مِٹھاس
عِطر میں ڈوبی ہوئی تازہ کلی رقصاں ہے آج
غرقِ نغماتِ طرَب ہے منظرِ کون و مکاں
ساز کی لَے پر صدائے زندگی رقصاں ہے آج
رُوحِ عالَم تیرتی ہے بحرِ احساسات میں
موجِ عشرت میں سُرِ زندگی رقصاں ہے آج

مستیاں اٹھلا رہی ہیں گلشنِ جذبات میں
روحِ بدمستِ خرامِ زندگی رقصاں ہے آج

ساری قدرت ہے مری دُنیائے امکانات میں
حکم سے میرے نشاطِ زندگی رقصاں ہے آج

دعوتِ نظّارہ دیتا ہے جمالِ جلوہ گاہ
شمعِ زرّیں کی سنہری روشنی رقصاں ہے آج

گونج اُٹھا منزلِ تخئیل کا رفعت کدہ
فکر کے رنگیں محل میں شاعری رقصاں ہے آج

سنہ ۱۹۵۰ء

آمدِ محبوب

لہلہاتی، جگمگاتی، رقص فرماتی ہوئی
مدّتوں میں آج وہ جانِ حیات آہی گئی
پھر وہی دلچسپیٔ نظّارۂ شامِ چمن
پھر بہارِ جلوۂ باغِ حیات آہی گئی
پھر ہے جوشِ لذّتِ سیرِ گلستانِ جمال
پورے جوبن پر بہارِ کائنات آہی گئی
اِک نئے انداز سے پھر سازِ ہستی چھڑ گیا
میرے کانوں میں صدائے کائنات آہی گئی

گونج اُٹھے پھر فضا میں نغمہ ہائے زندگی
وجد میں پھر آج روحِ کائنات آ ہی گئی

پھر شراب و شعر سے رنگین ہے بزمِ نشاط
پھول برساتی عروسِ کائنات آ ہی گئی

پھر وہی سرمستیاں ہیں پھر وہی مدہوشیاں
پھر حسیں ساغر میں صہبائے حیات آ ہی گئی

پھر وہی لطفِ جوانی پھر وہی کیفِ شباب
پھر وہی سرشاریٔ دورِ حیات آ ہی گئی

اُن نشیلی انکھڑیوں میں مَے لگی پھر ڈولنے
پھر نظر کو دعوتِ جامِ حیات آ ہی گئی

پھر نگاہوں میں سمٹ کر آ گیا حسنِ تمام
پھر مرے دِل میں سمائے کائنات آ ہی گئی

پھر جھکا کر شرم سے سر کر دیا خود کو سپرد
پھر مرے پہلو میں ساری کائنات آ ہی گئی

پھر مہک اُٹھے شمیمِ زُلف سے کون و مکاں
پھر نفس میں بوئے گلہائے حیات آ ہی گئی

آ گیا پھر میری باہوں میں چھریرا سا بدن
گود میں پھر رسمساتی کائنات آ ہی گئی

گرم بوسے پھر لب و رُخسار کے ملنے لگے
پھر رگوں میں تیزیٔ برقِ حیات آ ہی گئی

پھر مزا آنے لگا ہر جراتِ بیباک سے
آرزو تھی جس کی وہ پُر کیف رات آ ہی گئی

عالمِ مستی میں کھو کر سو گئے پھر حسن و عشق
پھر وہی کیفیتِ خوابِ حیات آ ہی گئی

سنہ ۱۹۵۰ء

اعجازِ تبسّم

حیات مسکرا اٹھی حیات مسکرا اٹھی
کہ آج پھر یہ بزم کائنات مسکرا اٹھی
جمال مسکرا اٹھا حیات مسکرا اٹھی
تبسّمِ نظر سے کائنات مسکرا اٹھی
نگاہ و دِل ہوئے مگن زماں مکاں ہیں خندہ زن
تو مسکرا اٹھی کہ کائنات مسکرا اٹھی

تمامِ جلوہ گاہِ زندگی ہے آج رقص میں
حیات کی خوشی سے کائنات مُسکرا اُٹھی

شباب ناچنے لگا حیات جھُومنے لگی
کچھ اس طرح سے رُوحِ کائنات مُسکرا اُٹھی

تِری نگاہِ مست نے کچھ ایسا سحر کر دیا
کہ آج تو تمام کائنات مُسکرا اُٹھی

تِری رسیلی آنکھ نے نہ جانے کیا دِکھا دیا
کہ سب غموں کو بھُول کر حیات مُسکرا اُٹھی

تِری نظر نے جھُوم کر نہ جانے کیا سُنا دیا
کہ جس کو سُنتے ہی مری حیات مُسکرا اُٹھی

تِرے حسیں لبوں نے آج کیا پیام سا دیا
کہ جس کو پا کے محفلِ حیات مُسکرا اُٹھی

تری نظر کے لطفِ خاص و حسنِ التفات سے
حیات کیا تمام کائنات مسکرا اٹھی

جب آگے بڑھ کے میں نے تجھ کو گود میں اُٹھا لیا
دوبارہ تیری چشمِ التفات مسکرا اٹھی

ترا گداز جسم بازوؤں میں بھینچتے سمے
ہر آرزوئے گوشۂ حیات مسکرا اٹھی

ترے لبوں پہ تھرتھراتے ہونٹ میں نے رکھ دیئے
ہر اک اُمیدِ سینۂ حیات مسکرا اٹھی

ترے حسیں لبوں کی سرخیوں کو چومتے سمے
ہزار رنگ سے مری حیات مسکرا اٹھی

پھر اس کے بعد ہی ہماری بیخودی کو دیکھ کر
یہ چاند مسکرا اٹھا یہ رات مسکرا اٹھی

سنہ ۱۹۴۸ء

انقلابِ حیات

ظُلمتوں سے ہوگیا تاریک ایوانِ حیات
تھر تھرا کر بجھ گئی شمعِ شبستانِ حیات

اب کہاں وہ روزِ روشن کی حسیں تابانیاں
اَب تو میں ہوں اور یہ شبہائے زندانِ حیات

اَب نگاہ و دل پہ ہیں چھائی ہوئی ویرانیاں
اَب کہاں وہ لذّتِ سیرِ گلستانِ حیات

آہ کِس نے زندگی سے مسکراہٹ چھین لی
آہ کِس نے کردیا ویراں گُلستانِ حیات

آہ بزمِ زیست پر اک موت طاری ہو گئی
انقلابِ دہر نے چھوڑا نہ امکانِ حیات

رُوح کے دردو اَلم میں غرق ہو جانے سے آہ!
کِس قدر بے چین ہے قلبِ پریشانِ حیات

زندگی کے دَم بَدم اِس طرح گھبرانے سے آہ!
منتشر سب ہو گئے ہیں ساز و سامانِ حیات

مُلتفت ہے اور نہ کوئی گوش بر آواز ہے
آج کچھ کھوئے ہوئے ہیں نغمہ سنجانِ حیات

اب نہ شمعوں کی ضیا ہے اور نہ جلووں کی چمک
ہے اندھیرا ہی اندھیرا زیرِ دامانِ حیات

کوئی موجوں کے تھپیڑوں سے بچا سکتا نہیں
آہ بڑھتا ہی چلا آتا ہے طوفانِ حیات

آہ مضطرؔ زیست میں کیسا ہوا یہ انقلاب
اب نہ وہ رُوحِ محبت ہے نہ وہ جانِ حیات

•

دِل کو ہوتا تھا ادا سنجِ نگاہِ کائنات
صرف اپنے درد کا محرم ہُوا تو کیا ہُوا

آہ وہ!

آہ وہ رُوحِ محبت آہ وہ جانِ حیات
میری اُمیدوں کی دُنیا میرے دل کی کائنات

مظہرِ حسنِ خلوص و پیکرِ حسنِ وفا
انقلابِ عالمِ جذبات کی راز آشنا

واقفِ آئینِ عشق و محرمِ رازِ خودی
جلوۂ کیف و مسرت شمعِ بزمِ زندگی

وہ مجسّم التفات و شوق کی آئینہ دار
وہ سراپا حسن باغِ زندگانی کی بہار

جس کے لب کی جنبشیں دیتی تھیں پیغامِ حیات
جس کے دِل کی دھڑکنیں کہتی تھیں رازِ کائنات

آہ کتنی دُور ہے اَب وہ جہانِ ہوش سے
آہ کتنی دُور ہے اب وہ مرے آغوش سے

آہ اَب تو اُس سے ملنے کی کوئی صُورت نہیں
آہ اَب جلوے نظر اُس کے نہ آئینگے کہیں

دیکھ پائے گی نہ چشمِ شوق وہ رعنائیاں
اب نظر سے دُور ہیں اُس حُسن کی پرچھائیاں

ٹھوکریں کھاتی ہے دُنیا کے اندھیرے میں نگاہ
سوچتا ہوں کس طرح طے ہوگی مستقبل کی راہ

آہ مضطر وہ کہاں بس اَب تو اُس کی یاد ہے
دل کی اِس اُجڑی ہوئی بستی میں غم آباد ہے

سنہ ۱۹۲۸ء

نگاہِ التفات

یاد ہے اے حُسن تیری وہ نگاہِ التفات
جس نے میری عقل کو سمجھا دیا رازِ حیات

جس نے اک طوفاں اُٹھایا عالمِ جذبات میں
جس نے ہلچل ڈال دی دُنیائے احساسات میں

جس نے دل میں زندگی کے ولولے پیدا کیے
جس نے جینے کے ہزاروں مشغلے پیدا کیے

جس نے میری کائناتِ عشق کی تخلیق کی
جس نے میری زیست کو بخشی متاعِ زندگی

جس نے پہونچایا مجھے اپنی محبت کا پیام
جس نے ہونٹوں سے لگایا بادۂ الفت کا جام

جس نے امیدوں میں پیدا کی بہاروں کی لہک
جس نے گلہائے تر و تازہ کی پھیلائی مہک

جس نے ہستی کو بنایا آشنائے سوز و ساز
جس نے غم دے کر کیا پیدا مرے دل میں گداز

جس نے روشن کی تخیل میں مرے شمع شعور
جس نے میری روح پر کی بارشِ نور و سرور

جس نے پیدا کیں نشاطِ آرزو کی صورتیں
جس نے دل سے دور کیں یاس و الم کی ظلمتیں

جس نے آئینِ محبت میں کیا اک انقلاب
جس نے ہستی کو مقاصد میں بنایا کامیاب

جس نے دل کو کر دیا دورِ جہاں سے باخبر
جس نے آنکھوں کو عطا کی روشنیٔ حق نگر

جس نے حل کیں جادۂ تدبیر کی سب مشکلیں
جس نے سلجھائیں مری فکر و نظر کی الجھنیں

جس نے ہر منزل میں سمجھائے رموزِ آگہی
جس نے کی ہر گام پر میری نظر کی رہبری

جس نے مجھ کو محرمِ رازِ حقیقت کر دیا
جس نے مجھ کو ترجمانِ قلبِ فطرت کر دیا

سانس لیتی ہے یہاں جس وقت تک میری حیات
بھول سکتا ہوں میں تیری وہ نگاہِ التفات؟

سنہ ۱۹۴۸ء

رفیقۂ حیات

نیا سرور اور نئی حیات لے کے آئی ہے
نشاطِ آرزو کی کائنات لے کے آئی ہے

مری خموش زندگی کی محفلِ سکوت میں
سرود و شعر و نغمۂ حیات لے کے آئی ہے

مچلتی رقص کرتی اور جھومتی نگاہ میں
ترانہ ہائے سازِ کائنات لے کے آئی ہے

نگاہ سے چھلک رہی ہیں حسن کی گلابیاں
لبوں پر موجِ بادۂ حیات لے کے آئی ہے

نہکتا حسن ہے کہ شعلۂ شباب نو بہ نو
نفس نفس میں گرمیٔ حیات لے کے آئی ہے

جبینِ ضوفشاں و جلوہ تاب و عطر بار پہ
شگفتگیٔ صبحِ کائنات لے کے آئی ہے

چمکتے عارضوں کے رنگ و نور کی شعاعوں میں
فروغِ حسنِ جلوۂ حیات لے کے آئی ہے

سیاہ کاکلوں کی مشک بیز نرم چھاؤں میں
حسین منظرِ شبِ حیات لے کے آئی ہے

رسیلی مسکراتی جگمگاتی مست آنکھوں میں
تمام جوششِ بحرِ کائنات لے کے آئی ہے

نگاہِ ناز کے اشارہ ہائے دل نواز میں
پیامِ زندگی باثبات لے کے آئی ہے

وہ گنگناتے رسمساتے پیکرِ گداز میں
سرودِ آبشارِ کائنات لے کے آئی ہے

وہ مستیاں بھری بہکتی لہلہاتی چال میں
نوائے کیفِ چشمۂ حیات لے کے آئی ہے

وہ مسکراہٹیں برستی نگاہِ شوق میں
تصورِ جہانِ ممکنات لے کے آئی ہے

بہارِ زیست کی نئی فضا سے کھیلتی ہوئی
شباب کی حسین کائنات لے کے آئی ہے

بہ حسنِ جلوۂ سحر بہ ہر ادا بہ ہر نظر
ترنم و تبسمِ حیات لے کے آئی ہے

بدل گیا بدل گیا نظامِ کہنۂ جہاں
نیا سماں نئے دن اور رات لے کے آئی ہے

سکونِ روح کے لئے شکیبِ قلب کیلئے
نظر نظر میں رنگِ التفات لے کے آئی ہے
غرض مری رفیقۂ حیات میرے واسطے
تمام جلوہ ہائے کائنات لے کے آئی ہے
سنہ ۱۹۴۹ء

رُباعی

یہ چاندنی رات میں نکھرتا ہوا حُسن
آرائشِ فطرت سے سنورتا ہوا حُسن
ہے آئینۂ جلوۂ فردوسِ شباب
کرنوں میں نظر کی رنگ بھرتا ہوا حُسن

زندگی کا نصب العین

زماں مکاں میں محبت کا نور پھیلا کر
میں کائنات کی تاریکیاں مٹاؤں گا
حیاتِ نو کی شعاعیں زمیں پہ برسا کر
ہر ایک گوشۂ عالم کو جگمگاؤں گا
جو بے خبر ہیں ابھی راہ و رسمِ ہستی سے
سکھاؤں گا انہیں جینے کے سو نئے انداز
جو بے نیاز ہیں احساسِ اوج و پستی سے
بتاؤں گا انہیں ہر انقلابِ زیست کا راز

مٹا کے قافلۂ دہر کی یہ گمراہی

دکھاؤں گا میں نئے راستے نئی منزل

بھلا کے دل سے جہاں کے فسانۂ ماضی

میں بزمِ حال کو دوں گا پیامِ مستقبل

بناؤں گا اسی دنیا کو میں نئی دنیا

یہ میرا مقصدِ ہستی ہے حاصلِ کونین

ہر ایک شے میں کروں گا میں زندگی پیدا

یہی ہے دوست مری زندگی کا نصب العین

سنہ ۱۹۴۷ء

شاعر کا نغمہ

محبّت کی شمعیں فروزاں کروں گا
زمان و مکاں کو دُرخشاں کروں گا
میں اَب اِتنی شمعیں فروزاں کروں گا
کہ منزل بہ منزل چراغاں کروں گا
زمانے کی اِن گھور تاریکیوں میں
چراغاں کروں گا چراغاں کروں گا
زمان و مکاں کو زمان و مکاں کو
درخشان کروں گا درخشاں کروں گا

یہ پُر ہول راہیں یہ تاریک عالم
میں اِن منزلوں میں چراغاں کروں گا

مجھے یوں ہی بہنے دو اے اہلِ ساحل
میں اندازۂ زورِ طوفاں کروں گا

قسم تیرے غم کی میں اب زندگی کو
غزلخواں و شاداں و رقصاں کروں گا

بدلنا پڑے گا نظامِ گلستاں
میں اب انقلابِ گلستاں کروں گا

نئی زیست کے مشوروں سے مُرتّب
نیا ایک آئینِ دَوراں کروں گا

بلندی پہ پہونچا کے انساں کو مضطر
میں نظّارۂ اَوجِ انساں کروں گا

سنہ ۱۹۴۸ء

تصویرِ مستقبل

انقلابات سے مِٹ جائے گا غم کا احساس
موجِ عشرت مرے ماحول میں رقصاں ہوگی
میری نظروں میں سِمٹ آئے گی دُنیائے جمال
اور ہستی مری فردوسِ بداماں ہوگی
نُور چھا جائے گا کُل وُسعتِ عالم پہ مِرا
مجھ سے پائیں گی ضیا حُسن کی جلوہ گاہیں
قافلے میرے سہاروں سے بڑھیں گے آگے
جگمگا جائیں گی دُنیا کی اندھیری راہیں

کثرتِ نُور سے تاریک رہے گا نہ جہاں
تابشِ علم سے محروم رہیں گے نہ دماغ
دہر پر تیرگیِ شب نہ رہے گی طاری
جھلملائیں گے ہر اک سمت محبّت کے چراغ
فطرتِ دہر میں اِک ایسا تغیّر ہوگا
ایک لمحے میں بدل جائیں گی سب تقدیریں
رُوحِ احساس غمِ حال سے ہوگی آزاد
ٹوٹ جائیں گی اسیری کی گراں زنجیریں
اس طرح دوست! مجھے فکر کے آئینے میں
ایک دُنیا نظر آتی ہے نشاطِ دل کی
اس طرح دوست! خیالات کی رنگینی سے
ایک تصویر بنی ہے مرے مستقبل کی

سنہ ۱۹۴۶ء

صبحِ مستقبل

جلد مٹ جائے گا یہ شب کا دھندلکا اے دوست
اور اِک جلوۂ پُر نور بھی آئے گا نظر

جلد خورشید جہاں تاب ہویدا ہو کر
ظلمتِ دہر پہ برسائے گا انوارِ سحر

جلد اے دوست یہ تاریک بھیانک چہرے
تیز اور سرخ شعاعوں سے درخشاں ہوں گے

جلد اے دوست یہ خوابیدہ و مردہ اجسام
زندہ و خندہ و تابندہ و رقصاں ہوں گے

چوم کر کلیوں کے ان رس بھرے ہونٹوں کو نسیم
خاص انداز سے چھیڑے گی نئے رنگ کا ساز
اور مدھر راگ سے گھولے گی دلوں میں اَمرت
بھیروِیں کی کوئی پُرکیف و سُریلی آواز
جلد تبدیلیاں ہوں گی بس اب اِس عالم میں
انقلابات سے ہوگی نئی تنظیمِ حیات
جلد بدلیں گی بس اب زندگیاں دُنیا کی
ختم پر ہے کوئی دو چار گھڑی اور ہے رات
لے وہ پھوٹی اُفقِ مشرق سے سُورج کی کرن
طے ہوئی راہِ سفر سامنے آئی منزل
اُٹھ مری جان! نئے دَور کا سامان کریں
صبح لائی ہے نئی زیست نیا مُستقبل

سنہ ۱۹۴۶ء

ہندوستان کا مستقبل

تصوّر کی روشنی میں

تمام حُسن و محبّت تمام نُور و سُرور
نظر نواز ہے یہ جلوۂ فروغِ وطن
یہ کائنات بھی اب جگمگا رہی ہے تمام
کہ عرش و فرش ہیں روشن زماں مکاں روشن
جہانِ زیست میں اب تیرگی کا نام نہیں
کہ گوشے گوشے میں اک روشنی ہے پھیلی ہوئی
دمک رہا ہے شعاعوں سے آج روئے حیات
بھرا ہوا ہے ضیاؤں سے دامنِ ہستی

خِرد کے نور نے چھوڑا نہیں کہیں باقی
رہِ عروج میں تاریکیٔ جنوں کا نشاں
بصد نشاط ہیں یہ کاروانِ علم و خبر
نئی حیات کی پُر نور منزلوں پہ رواں
ہے سب کی ایک سی حالت ہیں یہ سبھی خوشحال
تباہ حال نہیں کوئی کم نصیب نہیں
یہ دیش اب ہے سکھ اور شانتی کا گہوارہ
کوئی امیر نہیں ہے کوئی غریب نہیں
یہی ہیں زندگیٔ قوم کی نئی راہیں
یہی ہے زندگیٔ قوم کی نئی منزل
یہ رنگ و نور یہ شانِ جمالِ آزادی
یہ صبحِ نو ہے کہ ہندوستاں کا مستقبل

۱۹۴۶ء

رہنمائے عالم

نظامِ دہر بدلا، طور بدلے، زندگی بدلی
نہ وہ رہبر، نہ وہ راہیں نہ وہ جادہ نہ وہ منزل
جھلک آئینۂ امروز میں ہے رُوئے فردا کی
مری نظروں میں ہے اے ہمنشیں دُنیائے مستقبل
جہاں پھیلی ہوئی تھیں موت کی تاریکیاں ہمدم!
وہاں اب نور افشاں آفتابِ زندگانی ہے
جہاں زورِ الم تھا اور تھا دورِ غمِ پیہم
وہاں جوشِ مسرت ہے وفورِ شادمانی ہے

جہاں جہل و تعصب اور بیہوشی کی ظلمت تھی
وہاں اب آگہی ہے ہوش ہے نورِ حقیقت ہے
جہاں وہ شورشیں تھیں ظلم تھا نفرت ہی نفرت تھی
وہاں امن و سکوں ہے اور محبت ہی محبت ہے
ترقی کرتے کرتے ایک دن یہ دیش اے ہمدم!
جہاں کا رہنما ہوگا جہاں کا رازداں ہوگا
اسی سے روشنی پائے گا ہر اک ذرۂ عالم
یہی خضرِ حیات و مالکِ کون و مکاں ہوگا
یونہی اب مستقل ذوقِ عمل کی کامیابی سے
نئی ترتیب ہوگی زیست کے آئینِ محکم کی
بڑھیں گے قافلے سب دیکھ کر نقشِ قدم اس کے
کرے گا رہبری ہندوستاں اقوامِ عالم کی

جولائی ۱۹۴۷ء

نئی زندگی کا پیغام

آؤ! دُنیا میں نئی اک زندگی پیدا کریں
آؤ! اہلِ غم کو سامانِ خوشی پیدا کریں

آؤ! پہونچائیں اَجل والوں کو پیغامِ حیات
موت کی دُنیا میں رُوحِ زندگی پیدا کریں

آؤ! برسائیں جہاں کی ظلمتوں پر نورِ عشق
دہر کی تاریکیوں میں روشنی پیدا کریں

آؤ بے ہوشی کو اَب بخشیں متاعِ عقل و ہوش
عالَمِ ناآگہی میں آگہی پیدا کریں

آؤ! ان خالی کٹوروں میں بھریں پھولوں کا رس
زندگی کے خشک ہونٹوں میں تری پیدا کریں

آؤ! اہلِ درد کو سمجھائیں اسرارِ نشاط
موت والوں میں مذاقِ زندگی پیدا کریں

آؤ! جس میں موت بھی آئے تو بن کر زندگی
آج اک ایسا جہانِ زندگی پیدا کریں

آؤ! جن کو ایک مدت سے نہیں آئی ہنسی
آج اُن معصوم آنکھوں میں ہنسی پیدا کریں

آؤ! اس محرومِ حُسن و رنگ بزمِ زیست میں
رنگ بھی پیدا کریں اور حُسن بھی پیدا کریں

آؤ! بدلیں جلد یہ طرزِ نظامِ زندگی
زندگی میں انقلابِ زندگی پیدا کریں

اگست ۱۹۴۷ء

تلاشِ حیات

فضائے انقلاب میں
نوائے کامیاب میں
شراب میں شباب میں
عذاب میں ثواب میں
حیات کی تلاش ہے
حیات کی تلاش ہے
دِلوں کی ہر اُمنگ میں
گلوں کے حسن و رنگ میں

زمینِ خشت وسنگ میں
ترانہ ہائے جنگ میں
حیات کی تلاش ہے
حیات کی تلاش ہے
سرودِ آبشار میں
جمالِ لالہ زار میں
ہر ایک گُل میں خار میں
خزاں میں اور بہار میں
حیات کی تلاش ہے
حیات کی تلاش ہے
نفَس نفَس کے ساز میں
نظر نظر کے راز میں

نشیب اور فراز میں
نیاز اور ناز میں
حیات کی تلاش ہے
حیات کی تلاش ہے
نگاہِ التفات میں
صفاتِ حُسنِ ذات میں
ثبات و بے ثبات میں
وسیع کائنات میں
حیات کی تلاش ہے
حیات کی تلاش ہے

سنہ ۱۹۴۷ء

آزاد ہندوستان

آج دل آزاد ہے دل کا جہاں آزاد ہے
آج ہم آزاد ہیں ہندوستاں آزاد ہے
اب نگاہوں میں وہ رنج و غم کی تصویریں نہیں
دست و پا میں اب غلامی کی وہ زنجیریں نہیں
اب نہیں پابندِ زنداں قوتیں احساس کی
اب نہیں مہریں زبان و دِل پہ جبر و یاس کی
اب کوئی سرکش ہمارا سر جھکا سکتا نہیں
اِس بلندی سے ہمیں نیچے گرا سکتا نہیں

اے جوانانِ وطن بیدار ہو، ہشیار ہو!
اور بڑھنا ہے تمہیں آگے بڑھو! آگے بڑھو!
اَب عروجِ سعیٔ کامل پر پہنچنا ہے تمہیں
ہاں! بہت ہی جَلد منزل پر پہنچنا ہے تمہیں
یوں تو راہوں میں تمہاری مشکلیں بھی آئیں گی
جن میں چلنا ہے کٹھن وہ منزلیں بھی آئیں گی
لیکن اُن میں بھی تمہیں ہے کام لینا ہوش سے
ہر قدم آگے بڑھانا ہے نئے اک جوش سے
تُم کو اَب کرنا پڑے گا موت کو بھی زندگی
کامیابی پر تمہارے پاؤں چُومے گی خوشی
اپنے ملک و قوم کی منزل تمہارے ہاتھ ہے
اے جوانو! اَب تو مُستقبل تمہارے ہاتھ ہے

۱۹۴۷ء

تنظیمِ جہاں

اے دوست مجھے ظلمت کدۂ ہستی کو درخشاں کرنا ہے

دُنیا پہ اندھیرا چھایا ہے دُنیا میں چراغاں کرنا ہے

تغیر میں ہے رازِ ہستی تغیر ہے اک تنظیمِ نو

اب مجھ کو مرتب ایک نیا آئینِ گلستاں کرنا ہے

تصویرِ جہاں کیسی ہو گی! اندازِ جہاں کیسا ہو گا!

ہاں یہ تو بتا کیا رنگِ جہاں اے گردشِ دوراں کرنا ہے

تنظیمِ جہاں دشوار سہی جو کچھ بھی ہو دیکھا جائے گا

یہ کام تو اب اے دوست مجھے تاحدِ امکاں کرنا ہے

اے دوست بجا حیوان سے بھی اس دور کا انساں بدتر ہے
لیکن اسی حیواں سے بدتر انساں کو انساں کرنا ہے
اب ذکرِ حسن و عشق نہ کر یہ باتیں بعد کو سوچوں گا
پہلے تو مجھے اس روتی ہوئی تقدیر کو خنداں کرنا ہے
ان بحرِ الم کی بپھری ہوتی موجوں کا بھی منہ پھیروں گا
طوفان سے ٹکر لینا ہے اندازۂ طوفاں کرنا ہے
نامحکم ہے نظمِ عالم یہ نظمِ عالم ٹھیک نہیں
ہاں نظمِ عالم اور ابھی اک بار پریشاں کرنا ہے
اے دوست مجھے اب دنیا کی ان گھور اندھیری راہوں میں
یہ شمع نہیں روشن کرنی اس دل کو فروزاں کرنا ہے
وہ آتش دوزخ کے شعلے ہم سب نے بل کے بجھا ڈالے
اب اپنے وطن کو اے مضطرؔ فردوسِ بداماں کرنا ہے

سنہ ۱۹۴۸ء

فکرِ انقلاب

یہ بتاؤ تو ذرا ہند کے رہنے والو
تم کو اب اپنے فرائض کا کچھ احساس بھی ہے
اور آزادی کا مفہوم بھی سمجھے کہ نہیں
مادرِ قوم کی عزّت کا تمہیں پاس بھی ہے
تم کو معلوم ہے کچھ دیش کے افلاس کا حال
کتنے مزدور ہیں جو پیٹ نہیں بھر سکتے
قید کر رکھا ہے سرمایہ پرستوں نے جنہیں
جو تخیّل کو بھی آزاد نہیں کر سکتے

کتنے روٹی کے لئے پھرتے ہیں مارے مارے
مُتلاشی ہیں مگر اُن کے لئے کام نہیں
ہستیاں کتنی ہیں آلام کی ٹھکرائی ہوئی
زندگی میں جنہیں کچھ سُکھ نہیں آرام نہیں
اِمتیاز اور تعیّن کی حدیں ٹھکرا کر
تم کو اَب ایک نئی راہ پہ چلنا ہوگا
اَب نہ مجبور رہے گی کسی اِنساں کی جبلت
نظمِ ہستی کو بہت جلد بدلنا ہوگا

سنہ ۱۹۴۸ء

پیامِ مستقبل

قریب ہے قریب ہے نیا جہاں نیا جہاں
وہ سر جھکائے سامنے کھڑی ہیں کامیابیاں

سرور و کیف و سرخوشی کی منزلیں قریب ہیں
لطافتیں قریب ہیں مسرتیں قریب ہیں

بہت قریب ہے یہاں سے اب مقامِ ارتقا
بڑھو بڑھو ذرا سی دور پر ہے چشمۂ بقا

تمہارے واسطے نشاط کے پیام آئیں گے
تمہاری بزم میں مئے طرب کے جام آئیں گے

تمہیں تمام نور بن کے کل جہاں پہ چھاؤ گے
تمہیں ستارے بن کے آسماں پہ جگمگاؤ گے
فروغ پائیں گے تمہاری ضو سے یہ زماں مکاں
تمہارے رُخ کی تابشیں بنیں گی رشکِ کہکشاں
نگاہِ حسن میں تمہاری زینتیں بڑھائے گی
بصد خلوص زندگی تمہیں گلے لگائے گی
جہاں میں ہر طرح سے خود کو کامیاب پاؤ گے
پہنچ اوجِ زیست پر خوشی سے مسکراؤ گے
رواں تمہارا حکم ہوگا عالمِ حیات پر
تمہارا قبضہ ہوگا اس وسیع کائنات پر

ستمبر ۱۹۴۸ء

آئینِ مستقبل

یہ سوچنا ہے ہمنشیں! یہ سوچنے کی بات ہے
کیا رنگِ بزمِ دہر ہے کیا صورتِ حالات ہے
یہ دیکھ انساں کو ابھی انساں سے ہمدردی نہیں
محرومِ دردو غم ابھی دُنیائے محسوسات ہے
ہر گوشۂ عالم میں ہیں پھیلی ہوئی تاریکیاں
ہے کس جگہ دن کا نشاں سارے جہاں میں رات ہے
جس کی شعاعیں جگمگا دیتی ہیں یوم زیست کو
وہ آفتابِ زندگی در پردۂ ظلمات ہے

ظلم وستم نے چھین لی سب دولتِ امن وسکوں
ہر ایک دِل اِس دَور میں آزردۂ آفات ہے
اب اک اصُولِ کوششِ حاصِل بنانا چاہیئے
اب اک نیا آئینِ مُستقِل بنانا چاہیئے
انساں کو ہے اب سوچنا انجام بھی آغاز بھی
انساں کو ہے اب جاننا کون ومکاں کا راز بھی
انساں کو اب دُنیا میں اپنی کامیابی کے لئے
بننا پڑے گا زندگی کا ہمدم ودمساز بھی
اِنساں کو اب تقدیرِ ناکامی بدلنے کے لئے
سننا پڑے گی، انقلابِ دُہر کی آواز بھی
اِنساں کو اَب کُل وُسعتِ ہستی پہ چھانے کے لئے
کرنا ہے پیدا دِل کی ہر آواز میں اعجاز بھی

انساں کو اب رازِ حیات تو سمجھنے کے لئے
ہیں سیکھنے دُنیا میں جینے کے نئے انداز بھی
انسان کو جب حُسنِ عمل سے آگہی ہو جائے گی
یہ زندگی آئینہ دارِ زندگی ہو جائے گی

سنہ ۱۹۴۸ء

•

آؤ انساں کو مجبوریِ ہستی سے چھڑائیں
آؤ شیرازۂ قسمت کو پریشاں کر دیں

نئے اِمکانات

ہاں! یہ ممکن ہے مرے دوست کہ یہ آتشِ شوق
قصرِ اُمید کی شمعوں کو فروزاں کر دے
بھر کے انوارِ محبت سے مِرا دامنِ زیست
مرے ظلمت کدۂ غم میں چراغاں کر دے

ہاں! یہ ممکن ہے مرے دوست کہ یہ جامِ نشاط
دُور کر دے دلِ حساس کے رنج و آلام
کر کے ہستی کو مری غرقِ سرورِ ہستی
رُوحِ افسردہ کو پہونچائے خوشی کے پیغام

ہاں! یہ ممکن ہے مرے دوست کہ یہ سازِ حیات
دہر پر زندگیٔ اوج کے نغمے برسائے
اور اِس ساز سے نکلی ہوئی آوازِ بلند
رفعتِ عالمِ امکاں کی فضا پر چھا جائے

ہاں! یہ ممکن ہے مرے دوست کہ یہ جذبۂ عشق
عرش اور فرش کی وسعت کا احاطہ کر لے
کر کے یکجا نظرِ سلسلۂ حسنِ تمام
دامن و جیب میں کونین کی دولت بھر لے

ہاں! یہ ممکن ہے مرے دوست کہ یہ جلوۂ حسن
مرے اُجڑے ہوئے آغوش کو کر دے آباد
مسکرا اُٹھیں خوشی سے مری غمگیں نظریں
اور پوری ہو بہر طور مرے دل کی مُراد

ہاں! یہ ممکن ہے مرے دوست کہ اس زینت سے
اور نکھرے ابھی دوشیزگیٔ صبحِ چمن
کھِل اٹھیں پیار بھرے حسن کی تازہ کلیاں
رشکِ فردوس نظر آئے گلستانِ وطن
ہاں! یہ ممکن ہے مرے دوست کہ اس الفت سے
قوم میں ایک نیا جوش بھی پیدا ہو جائے
متحد ہو کے کرے کوششِ تعمیرِ جہاں
سعیٔ تکمیل سے تکمیلِ تمنا ہو جائے
ہاں! یہ ممکن ہے مرے دوست کہ ان جلووں سے
شبِ تاریک بھی بن جائے درخشندہ سحر
نور ہی نور ہو پھیلا ہوا ہر گوشے میں
ساری دنیا کو پھر اک عالمِ نو آئے نظر

ہاں! یہ ممکن ہے مرے دوست مرے شعروں سے
کروٹیں لینے لگیں سوتے ہوئے احساسات
زندگی جاگ اُٹھے دہر کی شکلیں بدلیں
انقلابات سے پیدا ہوں نئے امکانات

•

نہ رُک سکا کسی منزل پہ کاروانِ حیات
کہ عالمِ گزراں کو کہیں قیام نہیں

دھرتی کا سُہاگ

ایک حالت پہ کبھی رہ نہیں سکتی دُنیا
اِس کی ہر چیز بدلتی ہی رہے گی پیہم
زندگی موت کے ہاتھوں ہی بنا کرتی ہے
انقلابات ہیں اسبابِ نظامِ عالمُ
شام کی تیرگی جب دَہر پہ چھا جاتی ہے
انجم و ماہ سے کرتی ہے چراغاں فطرت
اور مشرق سے جب آتی ہیں زمیں پر کرنیں
صُبح کے نُور سے مِٹ جاتی ہے شب کی ظُلمت

چار سُو ہوتے ہیں جب شعلے تعصّب کے بلند
جب زمانے میں بھڑک اُٹھتی ہے اک زہر کی آگ
کر کے پھر شانت اُسے اَمن و سکوُں کی دیوی
اپنے ہاتھوں سے اَمر کرتی ہے دَھرتی کا سُہاگ
اے مرے دوست یہ تخریب ہے وجہِ تعمیر
قاعدہ ہے کہ بگڑ کر ہی بنا کرتے ہیں کام
انقلاب اور تسلسُل ہے بِنائے ہستی
اِن اصُولوں پہ ازل ہی سے ہے دُنیا کا نظام

سنہ ۱۹۴۸ء

شاعر

کیا کوئی حل کر رہا ہے عقدۂ دورِ حیات
غور سے کچھ سُن رہی ہے آج رُوحِ کائنات
کس کی نظروں میں ہے رنگِ انقلابِ زندگی
کس نے اُلٹے ہیں یہ اوراقِ کتابِ زندگی
کس کا دِل ہے گلستانِ زیست کا آئینہ دار
کس کے سینے میں ہے عکسِ جلوۂ روئے بہار
کس نے دیکھے ہیں ہزاروں نقشۂ دورِ خزاں
کس کی آنکھوں میں ہے تصویرِ زوالِ گلستاں

ظلمتوں میں کس نے روشن کی ہے شمعِ آگہی
کس نے کی راہ میں بھٹکے ہوؤں کی رہبری
کس کے دل کی دھڑکنیں ہیں رازدانِ حسن و عشق
کس کی تخئیل جواں ہے ترجمانِ حسن و عشق
کون رویا ہے شبِ غم کے نظارے دیکھ کر
کس کی آنکھیں نم ہوئی ہیں چاند تارے دیکھ کر
حسن کو مسرور پا کر مسکرا اٹھا ہے کون؟
خود سراپا نور بن کر جگمگا اٹھا ہے کون؟
کس کے دل سے اڑ رہی ہیں عشق کی چنگاریاں؟
کون ہے وہ شخص جس کی بے زبانی ہے زباں؟
کانپ اٹھے ہیں کس کی اک آواز سے دشت و جبل
کس نے دنیا کو دیا ہے بڑھ کے پیغامِ عمل

مُفلس و بیکس کے غم سے کس کا چہرہ زرد ہے
کس کے دل میں عالمِ انسانیت کا درد ہے
جاگتا ہے انتظارِ صبحِ مستقبل میں کون؟
مضطرب ہے اشتیاقِ جلوۂ منزل میں کون؟
کون آفاقی مصوّر ہے حسیں جذبات کا
کون ہے خلّاق اِن سحر آفریں نغمات کا
یہ بتا اے فکرِ انسانی! وہ انساں کون ہے؟
ناظرِ رفتارِ نبضِ بزمِ دوراں کون ہے؟
سچ کہا تُو نے کہ وہ انسان شاعر ہی تو ہے
سچ کہا تُو نے جہاں کی جان شاعر ہی تو ہے

سنہ ۱۹۴۷ء

نیا دور

اب تو پہلی سی کوئی بات نہیں ہے اے دوست
متغیر نظر آتے ہیں جہاں کے انداز
اب تو وہ صورتِ حالات نہیں ہے اے دوست
منقلب دور کی ہر چیز ہے اک عالمِ راز
اِس نئی راہ میں ہر ایک قدم پر اے دوست
سو قدم آگے نظر ڈال کے چلتی ہے حیات
قافلے والوں کے دل ہاتھ میں لے کر اے دوست
لاکھوں انسانوں کی تقدیر بدلتی ہے حیات

عصرِ حاضر کے اشاروں کو سمجھنے کے لئے
انقلاباتِ مسلسل پہ نظر رکھنا ہے
زندگی کی نئی منزل پہ پہنچنے کے لئے
اپنی ہستی کو بھی سرگرمِ سفر رکھنا ہے

عہدِ ماضی کے یہ فرسودہ خیالات اے دوست
حال میں اپنے کسی کام نہیں آ سکتے
مٹتے جاتے ہیں یہ دھندلے سے نشانات اے دوست
ان سے ہم اپنے مقاصد کو نہیں پا سکتے

عالمِ زیست نیا جلوۂ انساں بھی نئے
غور سے دیکھ یہ دنیا ہی کوئی اور ہے دوست
حسن اور عشق نئے وعدہ و پیماں بھی نئے
ساقی ہر چیز نئی ہے یہ نیا دور ہے دوست

ستمبر ۱۹۴۳ء

جب دُنیا میں انقلاب آتا ہے!

انقلاب آتا ہے دُنیا میں جب اے میرے دوست
چمنِ دہر کے سب رنگ بدل جاتے ہیں
زندگی اور بہاروں کا سماں دیکھتی ہے
حُسن اور عشق کے وہ ڈھنگ بدل جاتے ہیں
انقلاب آتا ہے دُنیا میں جب اے میرے دوست
زندگی والوں کو ملتے ہیں نئے پیغامات
چشمِ دوراں کے اشارات سے کھُل جاتے ہیں
اہلِ عالم کی نگاہوں پہ سب اسرارِ حیات

انقلاب آتا ہے دُنیا میں جب اے میرے دوست
زندگی کرتی ہے اک عالمِ نو کی تعمیر
بھر کے نظروں میں زمانے کی نئے عزم کا رنگ
کھینچتی ہے نئی صورت سے جہاں کی تصویر
انقلاب آتا ہے دُنیا میں جب اے میرے دوست
زندگی ڈھونڈنے لگتی ہے نئی منزلِ زیست
رُوبرو ہوتے ہیں حالات کے وہ آئینے
جن میں آتا ہے نظر جلوۂ مستقبلِ زیست

سنہ ۱۹۴۷ء

شادی ہوئی تو غم کے خزانے لُٹا دیئے
کچھ یوں دیئے جلائے کہ دِل ہی بُجھا دیئے

جوشؔ

تغیراتِ مسلسل

اُداس اُداس ہر اک منظرِ حیات ہے آج -
کہ سُونی سُونی سی یہ بزمِ کائنات ہے آج
وہ رنگ و نُور نہیں وہ چمک دمک بھی نہیں
کہ اُترا اُترا سا کچھ چہرۂ حیات ہے آج
شگفتگی ہے نہ پہلی سی لہلہاہٹ ہے
کہ اُجڑا اُجڑا سا یہ گلشنِ حیات ہے آج

کچھ ایسی یاس کی بے چینیاں ہیں چھائی ہوئی
کہ بے نیازِ سکوں روحِ کائنات ہے آج
ترے تغافلِ بیجا کا اِس قدر غم ہے
کہ دِل سے دُور تمنّائے التفات ہے آج
بگڑ گئے ہیں مصائب سے زندگی کے نقوش
کہ دھندلی دھندلی سی تصویرِ کائنات ہے آج
فنائے امن سے ہوتا ہے یہ مجھے محسوس
کہ اس جہاں کی ہر اک چیز بے ثبات ہے آج
ہر ایک چیز ہے درد و الم میں ڈوبی ہوئی
یہ کائنات بھی غرقِ غمِ حیات ہے آج
نشاطِ جادہ و منزل کا کچھ پتا ہی نہیں
غموں کی راہ میں کھوئی ہوئی حیات ہے آج

ارے یہ ظلم کی تاریکیاں تو دیکھ ذرا
نشاں کہاں ہے زمانے میں دن کا رات ہے آج
اک انقلابِ مسلسل ہے زندگی مضطر
جہانِ زیست میں دورِ تغیرات ہے آج

●

انقلابات نے دنیا ہی بدل دی اے دوست
عالمِ زیست کے جلووں کا عجب عالم ہے

یہ دَور

نہ اب وہ عصرِ تغافُل نہ التفات کا دَور
بدل گیا ہے بہت عشق کی حیات کا دَور
جہانِ زیست میں اب ہے تغیّرات کا دَور
بدل رہا ہے مسلسل مِری حیات کا دَور
یہی تو دیتا ہے آسانیوں کے پیغامات
یہ دَور ہی تو ہے ہستی کی مشکلات کا دَور
میں آشنائے غمِ زندگی ہوں اے ہمدم!
کہ میں نے دیکھا ہے دُنیا کے حادثات کا دَور

جب اس حیات میں یہ شورشِ حیات نہ تھی
گذر چکا ہے اک ایسا بھی اس حیات کا دور
تو جس کو حاصلِ صد زندگی بتاتا تھا!
ارے یہی ہے وہ آزادیِ حیات کا دور
بتا تو اے نظرِ انقلاب تو ہی بتا!
حیات کا یہ زمانہ ہے یا ممات کا دور
نظامِ عالمِ ہستی ہے اس قدر برہم
تو اس کو کہتا ہے تنظیمِ کائنات کا دور
ہر ایک نقشِ رہِ زیست مٹتا جاتا ہے
عجیب دور ہے دنیائے بے ثبات کا دور
جہاں حیات کو اپنا پتا نہیں ملتا
اب ایک ایسے ہی عالم میں ہے حیات کا دور

کوئی بھی بات جب اس دَور میں نہیں ممکن
پھر اِس کو کیسے کہے کوئی ممکنات کا دَور

ابھی نشاط کی صُورت نظر نہیں آتی
ابھی تو ختم نہیں ہے غمِ حیات کا دَور

ابھی خدا کے لئے نغمۂ حیات نہ چھیڑ
کہ خوش گوار نہیں عالمِ حیات کا دَور

اسی میں زیست کی تخریب کرتے جاتے ہو!
اسی کو کہتے ہو تعمیرِ کائنات کا دَور

سکوں سے سانس بھی لینا ہے جس میں ناممکن
اک ایسے دَور میں ہے آج کائنات کا دَور

وہ اتحاد و محبت وہ ربط اور وہ خلوص
بہت حسین رہا ہے تعلقات کا دَور

بدل گیا ہے زمانے کے روز و شب کا نظام
نہ اب وہ دن کا زمانہ، نہ اب وہ رات کا دور

میں تجھ سے پوچھ رہا ہوں تو ہی بتا مضطرؔ
حیات کا یہ زمانہ ہے یا ممات کا دور

سنہ ۱۹۴۸ء

❁

یہ غم کی رات یہ تاریکیاں یہ تنہائی
جدھر نگاہ اٹھے بے کسی کا عالم ہے

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے ۱۵ اگست ۱۹۵۰ء تک

مری نظروں میں اب تک رقص کرتی ہیں وہ تصویریں
رہائی کے حسیں خوابوں کی وحشتناک تعبیریں
ہُوا جب خاتمہ انگریز کے دورِ حکومت کا
جب اپنی قوم کی گردن سے اُترا طوق لعنت کا
وہ دن آیا مِلا جس دن ہمیں پیغامِ آزادی
وہ دن آیا سُنا جس دن وطن نے نغمۂ شادی
خوشی کی راہ میں کھوئے ہوئے تھے رہنما سارے
نظر آئے انہیں مستقبلِ رنگیں کے نظارے

ہر اک لیڈر نے سمجھا اب مکمل شادمانی ہے
حصولِ کامرانی ہی نشاطِ زندگانی ہے

یہ کیا معلوم تھا خوشیاں بدل جائیں گی ماتم میں
قیامت آفریں انداز بھی ہے لُطفِ پیہم میں

فرنگی کے نئے فتنے مسلسل کارفرما تھے
نظر اُٹھی تو کیا دیکھا عجب حالات پیدا تھے!

فرنگی جاتے جاتے بو گیا وہ بیج نفرت کا
کہ جس سے زہر آگیں پھل ہوا پیدا مصیبت کا

کیا وہ حشر برپا ملک کی تقسیم نے جانے
کہ جس سے انتشارِ دہر دیکھا چشمِ دُنیا نے

تلاطم آگیا غم کا اُٹھا پنجاب میں طوفاں
ہوئی انسانیت کے خون میں ہر آرزو پنہاں

وہ منظر یاد کر کے روح اب بھی کانپ جاتی ہے
مرے مجروح دل سے دکھ بھری آواز آتی ہے

ادھر پھر مشرقی بنگال میں محشر ہوا برپا
غریبوں بیکسوں پر قہر کا دستِ ستم اُٹھا

بڑے پُر درد ہیں حالات آفت سہنے والوں کے
ابھی تک آ رہے ہیں قافلے آزردہ حالوں کے

نظر میں جنتِ کشمیر کی بربادیاں بھی ہیں
کہ میرے سامنے تقدیر کی بربادیاں بھی ہیں

ابھی یہ قافلہ ہے بے نشاں، بے راہ، بے منزل
ابھی تاریکیوں میں قید ہے تنویرِ مستقبل

حوادث چھا رہے ہیں بھوک ہے افلاس ہے غم ہے
ابھی تک دیش میں ہر سمت مایوسی کا عالم ہے

۱۹۵۰ء

شعلۂ احساس

موسمِ سرما اندھیری رات اور یہ خامشی
یہ ہوا کے سرد جھونکے یہ فضا کی بے خودی
یہ گھنا جنگل یہ تاریکی یہ ظلمت کا سماں
غم کی موجوں میں تخیّل کھا رہا ہے ڈبکیاں
ایک ہلچل مچ رہی ہے عالمِ جذبات میں
ایک طوفاں اُٹھ رہا ہے بحرِ احساسات میں
خواب گاہِ ناز میں زردار محوِ خواب ہے
مضطرب شاعر کے سینے میں دلِ بیتاب ہے

زیست کے گرداب میں غلطاں ہے ساری کائنات
پیچ و خم کھاتی ہے مدّو جزر میں رُوحِ کائنات
یہ درختوں کے سیہ سائے، سڑک، سنسان راہ
وہم کے پھندوں میں اُلجھی جارہی ہے ہر نگاہ
کیکروں کی یہ قطاریں کتنی وحشتناک ہیں
سرسراتی پتیاں بھی کس قدر بیباک ہیں
دونوں جانب یہ فصیلیں دُور وہ ویراں کھنڈر
بکھرے بکھرے سے خیالوں کی یہ دُھندلی رہگذر
اور یہ بوسیدہ خیمے ٹوٹے ٹوٹے جھونپڑے
کون رہتے ہیں یہاں یُوں سِسکیاں ڈالے ہوئے
آہ یہ ہیں خانماں برباد آوارہ وطن !
آج یہ دُنیا ہے ان کے واسطے دارالمحن

جل رہا ہے پاس ہی اُس جھونپڑے میں اک چراغ
جیسے اک مُفلس کے سینے میں غمِ ہستی کا داغ

اک حسینہ رو رہی ہے بال بکھرائے ہوئے
زندگی پر ہیں ہزاروں رنج و غم چھائے ہوئے

آہ یہ دِق کی مریضہ کس قدر افسردہ ہے
غنچۂ پژمردہ کے مانند یہ پژمردہ ہے

رُوئے غمگیں سے ہے حسرت خیز مایوسی عیاں
چُپکے چُپکے لے رہی ہے سر جھکائے ہچکیاں

باپ ماں بھائی بہن کوئی نہیں یہ ہے یتیم
اس کے دل کو چھو نہیں پاتی اُمیدوں کی نسیم

آہ اس مجبور کے پاس اب کوئی پیسا نہیں
آہ اس دُنیا میں اس کا اب کوئی اپنا نہیں

جس طرف نظریں اُٹھاتی ہے جہاں تاریک ہے
یہ زمیں تاریک ہے یہ آسماں تاریک ہے

ہر طرف ناکامیاں افلاس کا مُبتنی ہیں حیال
کون کر سکتا ہے زخمِ بیکسی کا اِندمال

آہ اس کربِ مجسّم کا کوئی پیارا نہیں
درد بڑھتا جا رہا ہے اور کوئی چارا نہیں

کس طرح مجبور کے مہلک مرض کا ہو علاج
آہ یہ ناقص حکومت! آہ یہ ظالم سماج

ہسپتالوں میں بھی داخل ہو نہیں پاتے غریب
آہ یوں گھٹ گھٹ کے مرتے ہیں جہاں میں بدنصیب

بیکسوں کا اس جہاں میں آسرا کوئی نہیں
میں تو کہتا ہوں غریبوں کا خدا کوئی نہیں

سنہ ۱۹۵۰ء

چار سال گذر جانے کے بعد بھی

زندگی کے عالمِ احساس میں کھویا ہوا
دیر تک کل شام "نہرو پارک" میں بیٹھا رہا
ذہن پر اُبھرے ہوئے تھے دَورِ ماضی کے نقوش
آرزو کے بکھرے بکھرے دُھندلے دُھندلے سے نقوش
عشرتِ رفتہ کی تصویریں نظر آنے لگیں
پھر وُہی مانوس شکلیں قلب پر چھانے لگیں
دفعتہً پھر دل کو تڑپانے لگی یادِ وطن :
پھر تصوّر میں ہوئی ضَو پاش اپنی انجمن

پھر ہُوا جلوہ فگن احباب کا حسن و جمال
پھر عزیز و اقربا کا آگیا مجھ کو خیال
ہو سکے تھوڑی دیر کو میرا تخیل شاد کام
پھر وطن کے لالہ زاروں میں ہوا محوِ خرام
پھر وہی دریا وہی جنگل وہی نخل و شجر
پھر وہی وادی وہی صحرا وہی شاخ و ثمر
پھر وہی پُر کیف موسم پھر وہی تازہ ہوا
پھر وہی مُرغانِ خوش آواز کی پیاری صدا
پھر وہی جلوے وہی منظر وہی دلکش سماں
پھر وہی اپنا گُلستاں پھر وہی اپنا جہاں
پھر وہی نظارۂ رنگینیٔ رُوئے بہار
رقص کرتے جھومتے اور لہلہاتے کشت زار

پھر یکایک خرمنِ جذبات پر بجلی گری
شعلۂ احساس سے سینے میں بھڑکی آگ سی
آہ وہ بربادئ ہستی وہ خونیں انقلاب
آہ وہ خونریزی و غارت گری و اضطراب
جس سے برہم ہوگیا سارا نظامِ زندگی
مِٹ گئی اپنی مسرت چھن گئی اپنی خوشی
غرق تھا میں اِن خیالوں کے اندھیرے غار میں
قطرۂ خوں بھی نہ تھا اب دیدۂ خونبار میں
پھر جہاں بیٹھا ہوا تھا اُس فضا میں آگیا
چار سو سے یوں قہقہے گونجے کہ دل گھبرا گیا
اُٹھ کے سوئے آسماں ڈالی جو حسرت کی نظر
دل کی گہرائی سے لب تک آگئی اِک سرد آہ

پارک میں ہر سُو تھا اہلِ ذوق کا جوش و خروش
اور میں افسردہ دل، مغموم و مہجور و خموش

اپنی اُلفت کی دھڑکتی آگ میں جلتا ہُوا
خامشی سے گھر کی جانب سر جھکائے چل پڑا

سامنے کاریں رواں تھیں نُور برساتی ہوئی
نازنینیں جا رہی تھیں ناز فرماتی ہوئی

مہ جبینوں کا وہ حُسنِ برق پاش و برق ریز
وہ لباسِ شوخ و رنگیں وہ نگاہیں تیز تیز

وہ حسیں چہرے وہ زُلفیں وہ ادائے دلکشی
عارضوں کے رنگ کی تابندگی و روشنی

چلتے چلتے دُور اک تیرہ سڑک پر آگیا
شب کی ظُلمت سے فضاؤں میں اندھیرا چھا گیا

وہ سڑک کے ساتھ کی دیوار کا مُردہ وقار
وہ کھنڈر تعمیرِ عہدِ مُغلیہ کی یادگار
نصب تھے ٹوٹے ہوئے دو چار خیمے سے وہاں
جن میں تھے کچھ کُشتۂ جَور و جفائے آسماں
ایک خیمے میں جہاں کوئی نہ آتا تھا نظر
ایک بچہ رو رہا تھا اک کھردری کھاٹ پر
تھی وہاں بس ایک دیئے کی پھیکی پھیکی روشنی
انتہائے یاس سے چھائی ہوئی تھی مُردنی
میں کھڑا تھا اس جگہ رنجور و مغموم اور اداس
سخت حیرت تھی کہ کیوں کوئی نہیں بچے کے پاس
ایک عورت دوڑتی آئی اُدھر پھر ناگہاں
اور بچے کو لگی رو رو کے دینے تھپکیاں

مانگ کر لائی تھی دو پیسے کسی سے وہ اُدھار
گردشِ ایام کی ماری ہوئی زار و نزار
کر دیا تھا تین دن کی بھوک نے اُس کو نڈھال
بھوک کے بچے کو بلکتے دیکھ کر تھی پُرملال
تن پہ تھے بوسیدہ کپڑے یعنی میلے چیتھڑے
کہتی جاتی تھی کہ یہ جینا ہے بدتر موت سے
قلبِ ناامید پر پھر غم کے بادل چھا گئے
پھر مری حسرت بھری آنکھوں میں آنسو آ گئے
آہ پھر ٹوٹا ہوا دل لے کے آگے چل دیا
اِک دُکھی پرشار تھی بھی ساتھ میرے ہولیا
کہتا جاتا تھا وہ اپنی داستانِ رنج و غم
میری رگ رگ میں رواں تھا نشترِ درد و الم

کہہ رہا تھا وہ مصائب کا نہیں کوئی شمار
روٹی کپڑا ہی میسّر ہے نہ کوئی روزگار

آہ ہم مظلوم ہیں برباد ہیں ناشاد ہیں
رہنما اپنے یہ کہتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں

گر اِسے کہتے ہیں آزادی تو بربادی ہے کیا
گر اِسے کہتے ہیں آبادی تو بربادی ہے کیا

عیش و عشرت ہے سبھی ان غاصبوں کیواسطے
امن و راحت ہے سبھی ان غاصبوں کیواسطے

یہ بتاؤ ہم کو آزادی سے کیا حاصل ہوا؟
ہو گئے برباد آخر! اور ہم کو کیا ملا؟

ہم کو آزادی ملے گو ہو گئے ہیں چار سال:
کیا ہوا ہے کم کوئی دردو الم رنج و ملال؟

دُور ہے منزل، ابھی یہ جلوۂ منزل نہیں
حال کے رُخ پر ضیائے روئے مستقبل نہیں

سنہ ۱۹۵۱ء

●

سُنسان سی سڑکوں پہ یہ ٹُوٹے ہُوئے خیمے
زِندوں کے مزاروں کی طرف دیکھ رہا ہوں

انسانِ کامل

(ابوالہند مہاتما گاندھی کی برسی پر)

کھیل کر دولت و ثروت سے ہزاروں جیون
چین سے موت کے آغوش میں سو جاتے ہیں

بے خبر رہ کے ہر اک منزلِ ہستی سے یہاں
قافلے پیچ و خمِ راہ میں کھو جاتے ہیں

سانس لیتی ہیں فضاؤں میں بہت زندگیاں
اپنی ہستی کی حقیقت جنہیں معلوم نہیں

ہاں یہی زندگیاں موت ہے جن سے بہتر
زندگی کی کوئی قیمت جنہیں معلوم نہیں

سچ تو یہ ہے اُنہیں جینے کا کوئی حق ہی نہیں
جن کا ادراک ہے بیگانۂ احساسِ حیات
شورشِ دہر سے بیدار نہیں جن کا شعور
ڈھونڈتے رہتے ہیں جو مشکلِ عالم سے نجات
وہی اِنساں ہے حقیقت میں مکمل اِنساں
جس کے سینے میں نہاں درد ہے انسانوں کا
ٹکریں لیتا ہے امواجِ بلا سے پیہم
پھیر دیتا ہے جو رُخ وقت کے طوفانوں کا
اپنا گاندھی بھی تھا اس راز کا محرم اے دوست
اُس کی نظریں تھیں اِن اَسرارِ جہاں سے آگاہ
اُس کا دِل حسنِ صداقت کا اک آئینہ تھا
زیست کے اوجِ مقاصد پہ وہ رکھتا تھا نگاہ

اس کی نظروں میں تھی دراصل وطن کی عظمت
اپنے اِس دیش سے، اس قوم سے اُلفت تھی اُسے
وہ تھا سنسار کے امن اور اماں کا خواہاں
ایک انسان تھا؛ انساں سے محبت تھی اُسے
رنج تھا باغِ تمنا کی خزاں کا اُس کو
چاہتا تھا وہ اُمید وں کو گلستاں کرنا
اُس نے دیکھا تھا یہ تقسیمِ وطن کا انجام
چاہتا تھا وہ غمِ حال کا درماں کرنا
آہ پوری نہ ہوئی آخری کوشش اُس کی
دیدۂ آرزوئے دِل سے لہو بہہ نکلا
گولیاں "صدقِ مجسّم" کا جگر توڑ گئیں
دفعتہً سینۂ بسمل سے لہو بہہ نکلا

آہ وہ شامِ شہادت کا سماں آج کے دِن
یاد کر کے اُسے روتا ہے جہاں آج کے دِن

۳۰ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء

نوٹ:- مہاتما گاندھی کی زندگی، اُن کے فلسفۂ حیات اور اُن کی شہادت پر میں نے کئی نظمیں کہی ہیں۔ اس مجموعہ میں صرف یہی ایک شامل کی ہے
(مضطر)

رہبرِ اعظم

(پنڈت جواہر لال نہرو سے)

اے حیاتِ قوم رُوحِ قالبِ ہندوستاں
"اے امیرِ کارواں اے دستگیرِ کارواں"[1]
تُو نے پھیلائی اجل کی تیرگی میں روشنی
تُو نے مُردہ قوم کو بخشی متاعِ زندگی
تُو حقیقت آشنائے تلخیٔ حالات ہے
تُو مجسّم نور ہے تو فاتحِ ظلمات ہے

---

[1] یہ مصرع حضرت مولانا علامہ سیماب اکبرآبادی کا ہے

تیرا رُخ ہے نور بار و مہر چکاں و خُور فشاں
جگمگا اُٹھے ہیں تیری ضَو سے یہ کون و مکاں

تُو نے اہلِ زیست پر کھولے ہیں اَسرارِ حیات
تُو نے انساں کو کیا ہے رازدارِ کائنات

حل ہوئی ہیں سعیِ پیہم سے سیاسی مُشکلیں
طے ہوئی ہیں حادثاتِ دہر کی یہ منزلیں

ہاں تری نظروں میں جادہ بھی ہے اور منزل بھی ہے
ہاں! تجھے فکرِ نظامِ حال و مستقبل بھی ہے

اے نگہدارِ جہاں اے ذمہ دارِ زندگی
دیدنی ہے قوم کی بےچارگی و بےبسی

بھوک اور بے روزگاری مٹ نہیں پائی ابھی
لعنتِ سرمایہ داری مٹ نہیں پائی ابھی

ہاں ابھی بدلی نہیں ظالم زمینداروں کی خو
پی رہے ہیں یہ ابھی مفلس کسانوں کا لہو
اب ابھی رشوت خور اُدھر لے رہے ہیں رشوتیں
دیکھ یہ غارت گری یہ چوریاں یہ لُٹتیں
ہاں ابھی حق پہ نہیں ہوتا ہے حق کا فیصلا
خون ہوتا ہے حقیقت میں ابھی انصاف کا
فرقہ داروں کی یہ ذہنیت نہیں بدلی ابھی
اور اچھوتوں کی گری حالت نہیں سنبھلی ابھی
ہاں عوام الناس کو حاصل نہیں تسکینِ جاں
ہیں ابھی نظمِ حکومت میں بہت سی خامیاں
مانتا ہوں میں نہیں ان خامیوں سے بے خبر
مشکلاتِ حال و مستقبل پہ ہے تیری نظر

رہبرِ اعظم ہے تو اور مصلحِ اعظم ہے تو
آشنائے انقلاباتِ زرِ عالم ہے تو
اک نئے انداز سے اب ازم کی تنظیم کر
ملک کی اصلاح کر آئین میں ترمیم کر

سنہ ۱۹۴۸ء

•

وطن کے درد میں ڈوبی ہوئی ہیں دل کی آوازیں
ہمارے دل کی آوازیں ہیں مستقبل کی آوازیں

اندازِ جہاں

دیکھ! وہ سامنے ہے زیست کا پیلا چہرہ
دستِ فطرت نے الٹ دی ہے نقابِ عالم
ظلم و نفرت کی ہواؤں کے یہ جھونکے توبہ
منتشر ہو گئے اوراقِ کتابِ عالم
اب کہاں حسن کے وہ نقش و نگارِ رنگیں
یہ تو پیکر سے غم و یاس کی تصویریں ہیں
روحِ جذباتِ زمانہ ہے فسردہ سی رفیق!
قلب پر تلخیٔ حالات کی تحریریں ہیں

مسکراتی ہوئی کلیوں کے تبسم پہ نہ جا!
ذہن زخم ہے ہر اک گلِ خنداں اے دوست
دل کے رستے ہوئے زخموں سے ٹپکتا ہے لہو
چاک ہے سینۂ اربابِ گلستاں اے دوست
یہ المناک تباہی یہ اندھیرا یہ اجل
تیز آندھی ہے کہ طوفانِ فنا آتا ہے
وقت کی راہ کا مجبور و پریشاں راہی
حلقۂ دورِ حوادث میں گھرا جاتا ہے
منزلِ امن و محبت کا نشاں بھی تو نہیں
قافلہ زیست کا کس سمت رواں ہے اے دوست
انتشار اور یہ راہوں کا بھیانک منظر
عاقبت سوز یہ اندازِ جہاں ہے اے دوست

راہ روئے پیچ و خمِ جادہ و منزل میں اسیر
راہ برِ جذبۂ اغراض پرستی کے شکار
ظلم نے لوٹ لی بیکس کی متاعِ اُمید
دفعتہً ٹوٹ گیا سلسلۂ صبر و قرار
دہر کی چشمِ فسوں گر کے اشارات نہ پوچھ!
بحرِ احساس میں طوفان اُٹھا آتا ہے
دل میں وہ درد و خلش ہے کہ الٰہی توبہ
آدمی سانس بھی لیتے ہوئے گھبراتا ہے
شاطروں نے یہ نئی چال چلی ہے ساتھی!
ساری دُنیا ہی نظر آتی ہے غارت گرِ ہوش
فتنہ سازوں نے نیا ڈھنگ رچا ہے ساتھی!
گوشے گوشے میں ہے ہنگامہ و غوغا و خروش

اب یہ صورت ہے کہ بچنے کی نہیں شکل کوئی
اب یہ عالم ہے کہ منزل کی تمنا بے سود
جنگ کی آگ کا طوفان بڑھا آتا ہے
ہوگئیں زندگی و امن کی راہیں مسدود
شاطروں کی نئی سازش نے وہ پھینکا ہے فسوں
جس سے پیدا ہیں تباہی کے نئے امکانات
روس و امریکہ کی ٹکر کا بھی ہے وقت قریب
متغیر نظر آتے ہیں جہاں کے حالات
کوریا تک ہی نہ محدود رہیں گے شعلے
حشر اٹھنے کو ہے برسائیں گے وہ ایٹم بم
لیں گی آغوش میں دنیا کو بھیانک لپٹیں
یوں نہ ٹوٹے گا ابھی سلسلۂ ظلم و ستم

سارے عالم کی فضائیں ہیں قیامت بردوش
تیسری جنگ کے آثار نظر آتے ہیں
اک جہاں گیر تباہی کی تمنائیں لئے
روس و امریکہ بھی تیار نظر آتے ہیں
چشمِ امریکہ کے فتنے تو ہیں ظاہر لیکن
روس اب تک پسِ قوتِ چین آتش ریز
کوریا میں یہ عزائم کا تقابل کیا ہے
یہی شعلے ہیں وفنا پرور و محشر انگیز
سینۂ ارض پہ برسے گا لہوِ انساں کا
سرخ طوفان مٹا دے گا امارت کا نشاں
آگ اگلیں گے جو ایٹم کے دہانے پیہم
ظلمتِ یاس میں کھو جائے گی تنویرِ جہاں

انقلابات کی رفتار بہت تیز ہے آج
زندگی رنگ بدلتی ہی چلی جاتی ہے
حشر پرور ہیں زمانے کی فضائیں ساتھی
گوشے گوشے سے قیامت کی صدا آتی ہے
کوریا ہو ہی گیا جبر و تشدد سے تباہ
راگ تبت میں الاپا گیا بربادی کا
اور نیپال میں اب بڑھنے لگے ہیں خطرے
جانے کیا حال ہو اس دیش کی آزادی کا
اپنے لیڈر ہیں : خدا ان کو سلامت رکھے
ان کے آسائش و آرام میں آئے نہ خلل
راز مستقبل کشمیر کوئی بات نہیں
فیصلے ان کے مسلّم ہیں ارادے بھی اٹل

وہ[1] یہ کہتے ہیں کہ ظلمت کدۂ عالم پر
حسنِ تدبیر سے برسائیں گے ہم نورِ حیات
خواہشِ امن سے مٹ جائے گی یہ صورتِ جنگ
عالمِ زیست کو پہنچائیں گے پیغامِ ثبات
میرے ساتھی! مجھے ایسی کوئی امید نہیں
جنگ پرور ہیں یہی امنِ جہاں کے نگراں
دامنِ دل میں لئے بیٹھے ہیں اک حشر کی آگ
ان کے سینے میں قیامت کے شرارے ہیں نہاں
یہ بھڑکتے ہوئے شعلے یہ دہکتی ہوئی آگ
ایک آتشکدۂ غم ہے یہ دنیا تو نہیں
یہ لپکتی ہوئی لپٹوں کا بھیانک منظر
ایک طوفاں ہے قیامت ہے تماشا تو نہیں

[1] اہل امریکہ

سرخ بادل جو نظر آتے ہیں مغرب کی طرف
ان کے دامن میں دہکتے ہوئے انگارے ہیں
اور فضاؤں میں وہ منڈلاتی ہوئی چیلیں سی
میرے ساتھی! یہ پرندے نہیں طیارے ہیں
تیرا رُخ جانب مشرق ہے ادھر بھی دیکھوں!
کھوئی جاتی ہیں اندھیرے میں نگاہیں ساتھی
ظلمتیں چھائی ہیں اس سمت یہ تاریکی ہے
تیرگی میں نظر آتی نہیں راہیں ساتھی
قہر آلود نگاہوں سے برستی ہوئی آگ
اپنے آغوش میں دنیا کو لئے لیتی ہے
اور طوفان اٹھاتے ہوئے شیطانوں کو
امن کے نام سے بیدار کئے دیتی ہے

دم بدم موت کے غاروں سے دھواں اٹھتا ہے

پھیلتے جاتے ہیں لپٹوں کے بھیانک حلقے

سرخ آندھی بھی قیامت ہے قیامت ساتھی

سب چپ رہتے ہیں ہم دور یہاں حیرت سے

کیسے مٹ سکتا ہے انساں کی تباہی کا سماں

یہ ہے آغاز تو انجام جہاں کیا ہوگا؟

اہلِ عالم کا یہ تاریک ترین مستقبل

جو عیاں ہے وہ بھلا اور عیاں کیا ہوگا!

کوئی ریا پھوٹ پڑا حشر کے میدان کی طرح

دور و نزدیک قیامت سی نظر آتی ہے

رقص کرتے ہیں فضاؤں میں فنا کے شعلے

جنگ کی آگ بہت تیز ہوئی جاتی ہے

اتحادی جنہیں کہتے ہیں وہی فتنہ طراز
ٹینک اور توپ لئے پھرتے ہیں طیاروں میں
جھونکنا چاہتے ہیں اپنی غرض کی خاطر
ساری دنیا کو جہنم کے سیہ غاروں میں
سُرخ طوفان کی ہیبت سے لرزتی ہے زمیں
ایک پُرہول تباہی کا سماں طاری ہے
پیچھے ہٹ ہٹ کے بظاہر یہ لڑے جاتے ہیں
ورنہ دار پردہ "بڑے ظلم" کی تیاری ہے
غور کرتا ہوں میں جب صورتِ مستقبل پر
فطرتاً ذہن میں اٹھتا ہے یہ اک خاص سوال
اپنے نیتاؤں کا آئینِ عمل کیا ہوگا؟
کیونکہ اس جنگِ ہمہ گیر سے بچنا ہے محال

کتنی لاغر ہے یہ افلاس کی ماری ہوئی قوم
جسم بیجان سا ہے رُوح بھی بیمار سی ہے
اس اندھیرے میں نہیں کوئی شعاعِ اُمید
دل بھی مایوس سا ہے آنکھ بھی خونبار سی ہے
کھوئی کھوئی سی ہیں انساں کی پریشاں نظریں
وقت کے لب پہ ہے تکمیلِ مقاصد کا سوال
زندگی راہ میں برباد ہوئی بیٹھی ہے
شوق نے دیکھ لیا اوجِ تمنّا کا زوال
کھلبلی گوشۂ آفاق میں مچ جائے گی
مُطربِ وقت نے چھیڑا ہے قیامت کا وہ راگ
حشر آبادیٔ دُنیا کا بھیانک ہوگا
سارے عالم میں بھڑک اُٹھے گی یہ جنگ کی آگ

سنہ ۱۹۵۰ء

صدائے انقلاب

زندگی دہر کی راہوں میں رہی سرگرداں
آج تک مِل نہ سکا امن کی منزل کا سُراغ
کِس کو حاصل ہے سکوں کس کو میسّر ہے شکیب
فکرِ واوہام سے خالی ہے یہاں کِس کا دماغ
فتنہ سازوں کا ہر انداز ہے غارت گرِ ہوش
دِل پہ تخریبِ مسلسل کا فسوں طاری ہے
اُف یہ اشکوں کا تلاطم یہ اَلم کا طوفان
زخمِ پیشانیٔ دُنیا سے لہُو جاری ہے

عالمِ زیست کے اِس حال سے مستقبل پر
انقلابات زمانہ کا اثر دیکھیں گے
اب نئے دَور کے ماحول کی رعنائی میں
اہلِ دِل مقصدِ اربابِ نظر دیکھیں گے

میرے ساتھی! نہ اُلجھ شوق کے اِن جالوں میں
خوابِ راحت ابھی شرمندۂ تعبیر نہیں
اپنے رہبر کی یہ عظمت ہے فریبِ عظمت
ایک تنویر کا دھوکا ہے یہ تنویر نہیں

دیکھ! دنیائے سیاست کے خداؤں کی طرف
ان کے اعجاز نے کہرام مچا رکھا ہے
پھونک کر گوشِ تمنّا میں فسونِ اُمید
اہلِ اُمید کو دیوانہ بنا رکھا ہے

روز افزوں ہے یہ ناداریٔ و بیماریٔ قوم
ان کو آتا ہی نہیں درد کا درماں کرنا
چاہیئے اِن کو فقط اپنا عروج اپنا وقار
جانتے ہیں یہ پریشاں کو پریشاں کرنا
آج تک بات کوئی ان سے بنائے نہ بنی
کھیل جاری ہے مگر ان کی ملاقاتوں کا
عالمِ نور کے جلووں کا نشاں تک بھی نہیں
نگہِ یاس میں منظر ہے سیہ راتوں کا
آہ ہر طرح سے کر کے ہمیں برباد و تباہ
آج یہ مالکِ تقدیر بنے بیٹھے ہیں
ڈال کر اپنے گناہوں پہ فریبوں کی نقاب
حسنِ معصوم کی تصویر بنے بیٹھے ہیں

اِن کمینوں کے خریدے ہوئے بدکار غلام
پیٹتے پھرتے ہیں عظمت کا ڈھنڈورہ ہر سُو
اِن کی دیرینہ رفاقت کا چمن سُوکھ گیا
اب کہاں اِن کے شگوفوں میں وفا کی خوشبو
وقت آنے کو ہے ساتھی مرے! مایوس نہ ہو
اِن کے خوابوں کی یہ جنّت بھی اُجڑ جائے گی
رنگ محلوں کے یہ فانوس بھی بجھ جائیں گے
انقلابات کی وہ تند ہوا آئے گی
متزلزل سی ہے بنیادِ نظامِ حاضر
انقلابات کے آثار نظر آتے ہیں
متغیّر سے ہیں اندازِ جہانِ ہستی
منقلب دہر کے اطوار نظر آتے ہیں

قافلہ اپنا ہے دراصل بڑی مشکل میں
راہ تاریک ہے ملتا نہیں منزل کا سراغ
رہنمایانِ وطن نے غلط اندیشی سے
خود بجھائے ہیں دلِ افسردۂ امید کے چراغ
اُف یہ دنیائے سیاست کے خداؤں کا غرور
جس نے اخلاص کے بندوں کو کیا ہے برباد
ہم تو اب تک ہیں حقیقت میں بقیدِ آلام
اور یہ مالکِ تقدیر ہیں شاد و آزاد
لیکن اب صبر و تحمل کی حدیں ٹوٹ چکیں
زندگی مائلِ پیکار ہوئی جاتی ہے
آج وسعت کدۂ زیست کے ہر گوشے سے
نظمِ عالم کو بدلنے کی صدا آتی ہے

۱۹۴۶ء

ہر آئینہ ہے سنگِ حوادث کا نشانہ

رخسارۂ خوباں کو یہ معلوم نہیں ہے

جوشؔ

رقصِ شرار

نہ اب وہ رنگِ چمن ہے نہ وہ بہار کا رقص
فروغِ بادہ نہ خوبانِ گُل عذار کا رقص
وہ چہچہے نہ ترانے نہ تازگی نہ ہوا
وہ زمزمے ہیں نہ مُرغانِ شاخسار کا رقص
وہ ولولے نہ اُمنگیں نہ زندگی نہ فضا
وہ عشرتیں ہیں نہ جذباتِ کیف یار کا رقص

وہ بزم اور نہ وہ اہلِ بزم و مطربِ بزم
نہ وہ نوائے گہر ریز و نغمہ بار کا رقص

وہ نغمگی نہ ترنم نہ دلکشی نہ سرود
وہ گونج ہے نہ صدائیں نہ وہ ستار کا رقص

وہ دورِ جام نہ وہ چاندنی نہ وہ راتیں
وہ چشمِ مست نہ وہ روحِ میگسار کا رقص

وہ بے خودی ہے نہ لمحاتِ خود فراموشی
وہ مے کشی ہے نہ وہ جامِ زرنگار کا رقص

وہ خلوتیں نہ گرم ہائے شاہدِ رنگیں
وہ دل نہ شوق ہم آغوشئ بہار کا رقص

وہ شرم و شوق کی آمیزشیں نہ رنگِ حجاب
نہ قربِ حسن کے احساسِ خوش گوار کا رقص

وہ دل بری نہ ادائے سپردگیٔ جمال

وہ دل دہی نہ نگاہِ وفا شعار کا رقص

وہ جوشِ رغبتِ باہم نہ گرمیٔ اجسام

نہ حسن و عشق کے انفاس شعلہ بار کا رقص

وہ داستاں ہے نہ قصے نہ پیار کی نیتائیں

وہ قہقہے ہیں نہ خوابوں کے آبشار کا رقص

وہ لذتیں نہ خیالات کے دھندلکے ہیں

وہ شوخیاں نہ طربگاہِ لالہ زار کا رقص

وہ شہد و شبنم و گل ہے نہ وہ صباحتِ رخ

نہ مستیٔ نگہِ چشمِ پرخمار کا رقص

وہ نشہ اور نہ انگڑائیاں نہ مدہوشی

خرامِ ناز نہ اندازِ طرفہ کار کا رقص

وہ خط و خال نہ تزئینِ کاکُل و رُخسار
نہ وہ تبسمِ لبہائے غنچہ بار کا رقص

وہ فرقِ حسن کی رخشندگی نہ تابانی
وہ روشنی ہے نہ وہ صبحِ جلوہ یار کا رقص

وہ رنگ و نور کا طوفاں نہ موجِ بیداری
وہ آئینہ نہ تجلیِ روئے یار کا رقص

وہ کشت زار وہ دریا نہ وہ حسیں وادی
یہ کن خلاؤں میں ہے روحِ بیقرار کا رقص

وہ موسم اور وہ سماں ہے نہ آج وہ عالم
کہاں نشاط کا منظر کہاں بہار کا رقص

مری حیات کے دامن میں دیکھ اے مضطرؔ
الم کی آگ غمِ زیست کے شرار کا رقص

سنہ ۱۹۵۰ء

شامِ فراق

یہ ہجومِ غم یہ میری بےکسی شامِ فراق
زندگی کو رو رہی ہے زندگی شامِ فراق

دُور تک غم کی فضا میں جیسے گھٹتا ہو دھواں
ہر طرف پھیلی ہوئی ہے تیرگی شامِ فراق

نالہ زاروں میں ہے رقصاں آرزوؤں کا غبار
بزمِ حُسن و رنگ ہے بےکیف سی شامِ فراق

یہ نظم میں نے ۱۹۴۶ء میں کہی لیکن ناتمام رہی تھی غالباً جولائی ۱۹۵۱ء میں کچھ نئے اشعار شامل کر کے اسے مکمل کیا۔ مضطر

لٹ گیا ہنستی ہوئی معصوم کلیوں کا سُہاگ
مِٹ گئی پھولوں کی ساری دلکشی شامِ فراق

قلب کے صبر و سکوں کو کر رہی ہے پائمال
ہر گُل و غنچہ کی یہ پژمردگی شامِ فراق

شعلہ خیز و شعلہ ریز و شعلہ ساز و شعلہ بار
سوزِ داغ حسرتِ نظّارگی شامِ فراق

خالی خالی جام و مینا سُونا سُونا میکدہ
شعر و نغمہ ہے نہ لطفِ میکشی شامِ فراق

دَورِ ساغر ہے نہ رقصِ ساقیانِ خوش جمال
سازِ عشرت ہے نہ کیفِ نغمگی شامِ فراق

گردِ افکار و حوادث میں آئی ہیں گا کلیں
رُوئے عالم پر نہیں تابندگی شامِ فراق

دھندلا دھندلا سا ہے یہ آئینۂ حسنِ حیات
اُجڑی اُجڑی سی ہے بزمِ زندگی شامِ فراق

یہ الم یہ شدتِ احساس یہ بے چینیاں
نظمِ ہستی میں ہے کتنی برہمی شامِ فراق

آہ! جیسے ڈوبتی جاتی ہو نبضِ کائنات
روح پر طاری ہے یوں افسردگی شامِ فراق

ہے فضاؤں پر مسلط موت کی سی بے حسی
آہ یہ ماحول کی بدصورتی شامِ فراق

آہ یہ دل اور یہ مرگِ مسلسل کا سماں
آہ یہ بے حالی و بے چارگی شامِ فراق

یہ خیالاتِ پریشاں یہ مزاجِ مضمحل!
منتشر نظروں کی یہ آشفتگی شامِ فراق

ہر نفس غرقِ محیطِ اضطرابِ زندگی
ہر نظر ہے درد میں ڈوبی ہوئی شامِ فراق

چشمِ پُر نم انقلاباتِ آشنائے عشق ہے
کھل گئے رازِ خودی و بے خودی شامِ فراق

یہ گھنا جنگل یہ تاریکی یہ بے پایاں سکوت
کتنی وحشتناک ہے یہ خامشی شامِ فراق

یہ مناظر یہ کنارِ جُو یہ پگڈنڈی یہ کھیت
چھا رہی ہے ان پہ کیسی مُردنی شامِ فراق

اور اِدھر یہ گاؤں یہ تالاب اور یہ جھونپڑے
یہ دیوں کی پھیکی پھیکی روشنی شامِ فراق

آہ مضطرؔ اس طرح آنکھیں مری ویران ہیں
جیسے غم نے چھین لی ہے زندگی شامِ فراق

۱۹۴۶ء

شبِ فراق

اَللہ رے یہ تیرگیٔ غم شبِ فراق
وحشت طرازِ یاس کا عالم شبِ فراق
ہر آرزو ہے حاصلِ صد غم شبِ فراق
ارماں ہیں صرفِ نوحہ و ماتم شبِ فراق
دِل محوِ آہ و نالۂ بے چارگیٔ عشق
آنکھیں ہیں وقفِ گریۂ پیہم شبِ فراق

یہ نظم میرے طالب علمی کے دور کی ہے شعر کہتے تین سال گذرے تھے اس زمانے میں عموماً غزل ہی کہتا تھا معشوق سے ایک رات کی علیحدگی پر یہ اشعار ہوئے سات برس ہونے کو آئے لیکن وہ تلخیاں آج بھی یاد ہیں (مضطر)

آنسو ہیں گرم گرم رواں تر ہے آستیں
غرقِ الم ہے دیدۂ پُرنم شبِ فراق
فطرت بھی رو رہی ہے مرے حالِ زار پر
بکھرے پڑے ہیں قطرۂ شبنم شبِ فراق
نظروں پہ چھا رہی ہیں حوادث کی ظُلمتیں
آغوش میں ہے زندگیٔ غم شبِ فراق
بستی یہاں سکوں کی نہیں دُور دُور تک!
ہے ایک انتشار کا عالم شبِ فراق
ناکامیوں نے کر دیا برہم نظامِ زیست
ہے کائنات شورشِ پیہم شبِ فراق
مضطرؔ یہ انتہائے غم و اضطراب ہے
خود بن گیا ہوں دردِ مجسّم شبِ فراق

مارچ ۱۹۴۵ء

اشکِ رواں

آہ یہ غم یہ حیاتِ گزراں کا عالم
مستقل سلسلہ سوزِ نہاں کا عالم

تم کو معلوم ہے شاید غمِ پنہاں میرا
تم نے دیکھا ہے مرے اشکِ رواں کا عالم

آہ وہ شب وہ ملاقات کا دلکش منظر
آہ وہ دل وہ تمنائے جواں کا عالم

وہ ہوائیں وہ فضائیں وہ گلستاں وہ بہار
لطفِ نظّارگیٔ لالہ رخاں کا عالم

آہ وہ جلوۂ صد رنگ حسینانِ چمن
آہ وہ انجمنِ زہرہ وشاں کا عالم
ساقیٔ میکدہ بردوش و چمن در آغوش
التفاتِ نگہِ بادہ فشاں کا عالم
آہ وہ ساغرِ سرشار وہ دورِ مے و جام
آہ وہ روشنیٔ کون و مکاں کا عالم
آہ وہ ساز وہ نغمات وہ حسنِ رقصاں
وہ سماں اور وہ نشاطِ دل و جاں کا عالم
وہ نشاط و طرب و کیف و سُرور و عشرت
حاصلِ زندگیٔ عیشِ جہاں کا عالم
اُف وہ دوشیزگی و غنچگیٔ حسن و شباب
چاندنی اور وہ مہِ نور فشاں کا عالم

قہقہے مست جوانی کے الہٰی توبہ
برقِ رخشندگیٔ جلوہ کناں کا عالم
روئے تاباں پہ وہ رقصندہ تجلّیٔ جمال
جسمِ سیمیں میں وہ امواجِ رواں کا عالم
انکھڑیوں میں وہ مچلتی ہوئی شوخی کی جھلک
ہر اشارے میں وہ جذباتِ عیاں کا عالم
کاکلوں کی وہ مہک اور وہ لبوں کی خوشبو
آہ وہ پیکرِ فردوسِ جہاں کا عالم
وہ ہم آغوشی و ہم رنگی و ہم آہنگی
آہ وہ بے خودیٔ خوابِ گراں کا عالم
آہ وہ ربطِ مسلسل وہ فروغِ ہستی
اب کہاں وہ کششِ حسنِ جواں کا عالم

سنہ ۱۹۵۱ء

اگرچہ ترکِ مُلاقات کو زمانہ ہوا

تو اَب بھی میرے تصوّر میں رقص کرتی ہے

تِرے جمال کی دوشیزگی و رعنائی

مِری اُداس نگاہوں میں رنگ بھرتی ہے

سنہ ۱۹۵۱ء

زندگی کیا کسی مُفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

فیضؔ
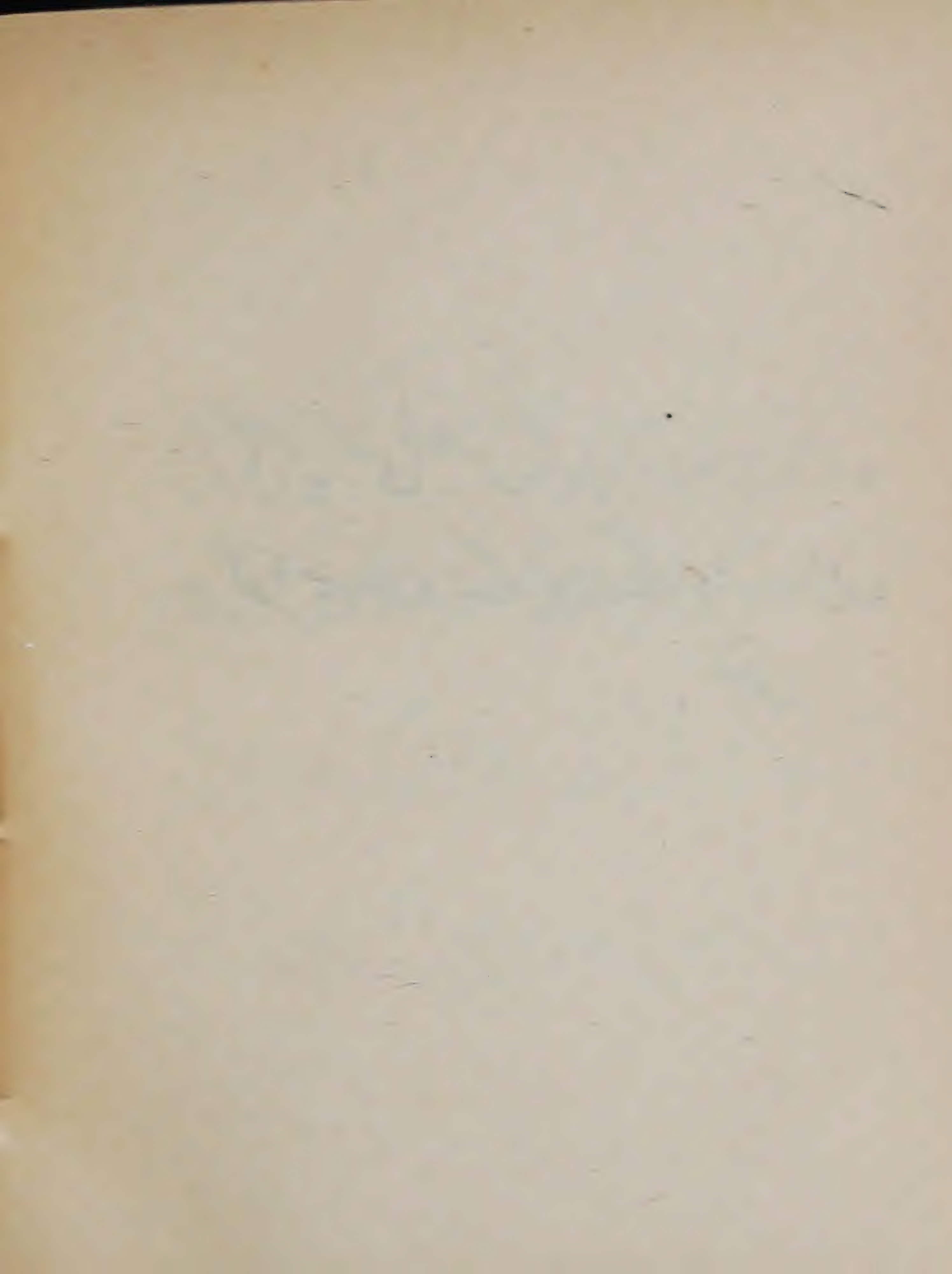
مفلس کی موت

دل کو اُمیّد کے مرنے سے وہ صدمہ پہنچا
دفعتہً رُک گئی احساس کی نازک دھڑکن
گرم جذبات کی بھنکتی ہوئی نبضیں چھوٹیں
ہوگیا سرد تمناؤں کا گل رنگ بدن
شوق کے چہرۂ پُرنور پہ زردی چھائی
ہچکیاں لیتی ہوئی آس نے دم توڑ دیا
بسترِ مرگ پہ بیمار نے کروٹ بدلی
زندگی رُوٹھ گئی رُوح نے منہ موڑ لیا

اب وہ آہیں ہیں نہ ٹیسیں ہیں نہ وہ دردِ خلش
شکوہ رنج و الم ہے نہ مصائب کا گِلہ
اب وہ شورش ہے نہ حسرت ہے نہ بیچینی ہے
واہ کیا خوب دیا وقت نے جینے کا صِلہ
سنہ ۱۹۵۰ء

•

تھرتھراتا ہے ہر اک تارِ ربابِ ہستی
نغمۂ عیش و طرب آج ہے بے وقت کا راگ
دستِ تخریب نے لوٹا ہے بصد ظلم و ستم
آرزوؤں کی مہکتی ہوئی کلیوں کا سہاگ
سنہ ۱۹۵۰ء

موت کے سائے

یہ بیاباں یہ اندھیرا یہ خموشی یہ سکوت
جس طرف دیکھئے ویرانی ہی ویرانی ہے
دھندلا دھندلا سا ہے آئینۂ احساس و نگاہ
کھوئے کھوئے سے خیالوں میں پریشانی ہے
اگلے وقتوں کا یہ ویران و شکستہ گنبد
یہ پرانے در و دیوار یہ ٹوٹا سا مزار
اجڑی اجڑی سی یہ پرہول عمارت یہ کھنڈر
ان میں آباد ہیں کچھ زندگیاں زار و نزار

زرد چہرے ہیں کہ مدقوق جوانی کے نشاں
سرد ڈھانچے ہیں کہ افلاس کے زندہ لاشے
عورتوں اور یہ مردوں کے سُلگتے آنسو
آہ یہ بھوک کی شدّت سے بلکتے بچّے
کس قدر ملک کی تقسیم نے برباد کیا
کس قدر ان پہ زمانے نے ستم ہیں ڈھائے
سانس لینا نہیں آزاد فضاؤں میں نصیب
سر پہ ہیں موت کے تاریک و بھیانک سائے[1]

۱۹۵۰ء

[1] اب ایسی ترکیبیں رواج پا چکی ہیں۔ مضطر

تاریک صبح

یہ صبح اور یہ بارش یہ برف باد ہوا
یہ سرد سرد فضاؤں میں تیرگی کا سماں
یہ ظلمتوں کا تسلط یہ آسماں یہ زمیں
یہ کالی کالی گھٹائیں یہ تیز تیز دھواں
یہ بھیرویں کی صدا آرہی ہے کانوں میں
کسی امیر کی کوٹھی میں بج رہا ہے ستار
شرابِ عیش سے مخمور مال و زر کے خدا
منا رہے ہیں بصد رنگ جشنِ فصلِ بہار

اِدھر یہ ٹوٹے ہوئے جھونپڑوں میں قسمت پر
تباہ حال غریب الوطن ہیں اشک فِشاں
یہ بَدنصیب ہیں محروم آرزوئے حیات
کہ اِن کے واسطے تاریک ہو گیا ہے جہاں

۱۹۵۰ء

•

یہ گرجتے ہوئے بادل یہ گھٹاؤں کا دھواں
برق کی موج فضاؤں میں مچل جاتی ہے
گرم جذبات بھٹکتے ہیں سمٹ جاتے ہیں
تندیٔ احساس سے چھاتی بھی دہل جاتی ہے

۱۹۵۰ء

دھواں دھار گھٹائیں

یہ اندھیرا یہ دھواں دھار گھٹائیں یہ گرج
ایک طوفان ہے بارش کا کہ تھمتا ہی نہیں
اُف یہ ظُلمت یہ تباہی کا بھیانک منظر
آسماں تیرہ و تاریک ہے جَل تھَل ہے زمیں
یہ رُخِ صبح ہے یا شام کا کالا چہرہ
آج تو رات کے آغوش میں دِن نِکلا ہے
عالَمِ دِل کی فضاؤں میں ہے آفات کی دھند
وسعتِ ذہن پہ بھی اَبرِ اَلم چھایا ہے

آہ یہ غم کے ستائے ہوئے مُفلس انساں
کتنے حیران و پریشان نظر آتے ہیں
کوٹھیاں راہ نماؤں کی چمک اُٹھتی ہیں
کیمپ اور جھونپڑے پانی میں بہے جلتے ہیں

سنہ ۱۹۵۰ء

•

حسن کا رقص ہے دولت کے صنم خانوں میں
جگمگاتے ہوئے چہرے ہیں کہ مہ پارے ہیں
اور سرِ راہ یہ مُفلس کے بِکھرے سے بچے
میری نظروں میں غم و یاس کے نظارے ہیں

سنہ ۱۹۵۰ء

آگ کا طوفان

تند شعلے ہیں کہ بڑھتے ہی چلے آتے ہیں
آگ ہر سمت بھڑکتی ہی چلی جاتی ہے
امن کی سرد فضاؤں میں دھواں گھٹنے لگا
جنگ اَب موت کے مانند بڑھی آتی ہے
اُف یہ دُنیا کی تباہی کا بھیانک منظر
چار سُو آگ کا طوفان نظر آتا ہے
یاس و حرماں کے دہکتے ہوئے انگاروں نے
میری امید کے چہرے کو جھلس ڈالا ہے

وہ برسنے لگے زردار کی آنکھوں سے شرار
جھونپڑے جلنے لگے جلنے لگے جلنے لگے

وہ اٹھیں بھوک کے سینے سے فنا کی لپٹیں
فاقہ کش ڈھانچ اُدھر تڑنے لگے گلنے لگے

کارفرما ہے ہر اک کام میں شیطان کا ہاتھ
کتنا موہوم ہے گمنام ہے انساں کا وجود

اس نظام غلط آئین کی اس شورش میں
امن و آسائش و آرام کی کوشش بے سود

۱۹۵۱ء

تباہی

جب میں دُنیا کی تباہی پہ نظر کرتا ہوں
میرے رنگین خیالات بکھر جاتے ہیں
زندگی لیتی ہے جب جائزۂ صورتِ حال
ذہن پر دھندلے سیہ نقش اُبھر آتے ہیں
اور جب وقت کی دھندلائی ہوئی راہوں میں
کرنے لگتی ہے مری فکر تلاشِ منزل
بیٹھنے لگتا ہے مایوسِ تمنا ہو کر
میرا حیران سا مجبور سا ناکام سا دِل

اور جب اپنے دُکھی دیش پہ کرتا ہوں نگاہ
دِل سے اک جلتی ہوئی آہ نِکل جاتی ہے
شِدّتِ درد سے ہو جاتی ہے بے چین حیات
رُوح گھُٹتی ہی تڑپتی ہے مچل جاتی ہے
کہیں بھونچال جو آتا ہے تو گرتے ہیں مکاں
اور سیلاب سے ہوتی ہے کہیں بربادی
حادثے ہوتے ہیں ریلوں کے اُلٹنے سے کہیں
اس مصیبت میں ہے ہر اہلِ وطن فریادی

سنہ ۱۹۵۰ء

وقت سے جنگ

مُنہ اندھیرے ہی نکل آیا ہوں جنگل کی طرف
سامنے دُور وہ شفاف سا چشمہ ہے رواں
اور نزدیک لہکتے ہوئے سبزے پہ یہ اوس
بھیگی بھیگی سی فضاؤں میں دُھندلکے کا سماں
گدگداتے ہیں درختوں کو ہوا کے جھونکے
ٹہنیاں ہلتی ہیں بوندوں کی جھڑی لگتی ہے
پتیاں ناچ کے گاتی ہیں سُریلے نغمے
لُطف آتا ہے ترنّم کی ہم آہنگی سے

وہ چھٹا ابر وہ ہلکی سی سفیدی پھیلی
وہ نظر آنے لگے جھونپڑے مزدوروں کے
اور کچھ پاس ہی اُس سمت اُدھر میداں میں
کیمپ ہیں رنج میں گھُلتے ہوئے مجبوروں کے
آہ یہ درد یہ آفت یہ الم یہ افلاس
دُکھ اُٹھاتی ہوئی مخلوق کا یہ حالِ زبوں
میرے سینے میں بھڑک اُٹھے بغاوت کے شرار
جی میں آتا ہے چلوں وقت سے اب جنگ کروں

سنہ ۱۹۵۰ء

منزلیں گرد کے مانند اُڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گُزراں ہے کہ جو تھا

فراقؔ

غزلیں

۱

بزمِ امروز کا وہ رنگ کہاں ہے اے دِل
زندگی آج حدیثِ دِگراں ہے اے دِل

ہر نظر حادثۂ رنج و نشاطِ دُنیا
ہر نفَس مرحلۂ سُود و زِیاں ہے اے دِل

بال کھولے ہوئے ماتم میں ہے لیلائے حیات
کائنات آج تمام آہ و فغاں ہے اے دِل

آج بھی زیست کی پُر پیچ و سیہ راہوں میں
کارواں حُسن و محبت کا رواں ہے اے دِل

بھید ہی بھید سہی حُسن کے ناز و انداز
فطرتِ عشق بھی اک رازِ نہاں ہے اے دِل
پُرسشِ چشمِ کرم پر یہ پُراسرار سکوت
پھر توجہ پہ تغافل کا گماں ہے اے دِل
سُرخیاں کس کے لہو کی ہیں اُفق پر کہ نگاہ
گل چکاں شعلہ فشاں رقص کناں ہے اے دِل
محشرستانِ محبت کا عجب عالم ہے
ہر طرف ایک اُداسی کا سماں ہے اے دِل
آبگینوں کی نزاکت پہ نظر رہتی ہے
یہ جہاں کارگہِ شیشہ گراں ہے اے دِل
آہ یہ خستگیٔ طبع کا احساس کہ اب
التفاتِ نگہِ ناز گراں ہے اے دِل

۱۹۵۱ء

۲

پھر اُن خموش نگاہوں نے یہ سوال کیا
دِلوں کا رنگ نہ پہچاننا ہے کس کی خطا
مِلا بھی اور اُسے دیکھ بھی لیا! لیکن
میں سوچتا ہی رہا اُس نے کچھ کہا نہ سُنا
وہ دَورِ عیش کی رنگینیوں میں غرق رہی
میں اپنے عشق کا انجام سوچتا ہی رہا
تری نگاہِ محبت کی چوٹ کھا کے یہ دِل
ترانہ ہائے غمِ کائنات میں ڈوبا
ترے الم نے وہ آفاقیت مجھے بخشی
مری حیات نے دُنیا کے غم کو اپنایا

یہ شوخیاں پسِ پردہ بقیدِ رسم و رواج
تری نظر کے تغافل کا راز جان لیا

گذر گیا رہِ دنیا سے کاروانِ حیات
سکونِ زیست کی منزل کا کچھ پتا نہ چلا

۱۹۵۰ء

٭

یہ بے خودی یہ تغافل یہ بے نیازی چھوڑ
اب اِس نگاہ میں کچھ التفات پیدا کر

۳

حُسن کا کچھ پتا بھی ہے عِشق کا کچھ نشاں بھی ہے
رہبرِ کارواں بتا ! منزلِ کارواں بھی ہے
جس میں یہ شورشیں نہ ہوں ایسا کوئی جہاں بھی ہے
اے دِل دردآشنا غم سے کہیں اماں بھی ہے
کچھ تو مزاجِ حُسن پر آہ و فغاں گراں بھی ہے
کچھ وہ نگاہِ ناشناس عشق سے بدگماں بھی ہے
محرمِ حال و واقفِ سوزِ غمِ نہاں بھی ہے
حُسن کی چشمِ التفات عشق کی رازداں بھی ہے
جس کو تری تلاش تھی جس کو تری تھی جستجو
اس کا کہیں پتا بھی ہے اس کا کہیں نشاں بھی ہے

کیا ہو مآلِ ذوقِ دید دیکھتے دِل پہ کیا بنے
حُسن کی جلوہ گاہ میں عشق کا امتحاں بھی ہے

شکوۂ دردِ ہجر کیا جَور و سِتم کا کیا گِلہ
اَب تو وہ مُلتفِت بھی ہے اَب تو وہ مہرباں بھی ہے

یہ نہ سمجھ کہ ہر صدا صرف خوشی کا ہے پیام
دَہر کی بزمِ حال میں ماتمِ رَفتگاں بھی ہے

عالَمِ بے ثبات میں وُسعتِ کائنات میں
راہِ غمِ حیات میں منزلِ جاوداں بھی ہے

رُخ پہ ہزار ہیں نقاب پھر بھی نظر ہے بے حجاب
جلوۂ حُسنِ کامیاب ہو کے نہاں عیاں بھی ہے

آرزوئے نشاط سے یاد غموں کی آ گئی
وصلِ طَلب نگاہ میں ہجر کی داستاں بھی ہے

اے مری جانِ زندگی آج مری حیات کو
کچھ غمِ دہر بھی ہے اور کچھ غمِ دوستاں بھی ہے

پھر بھی اسیرِ رسمیات رہ نہ سکی نگاہِ عشق
گرچہ حیات کے لئے قیدِ زماں مکاں بھی ہے

ترکِ تعلقات سے زندگیاں بدل گئیں
حُسن کی کچھ نہ پوچھیے عشق تو شادماں بھی ہے

۱۹۴۸ء

●

کیسے بتاؤں کہ یہ خود مجھے نہیں معلوم
مری حیات بھی میری حیات ہے کہ نہیں

۹

کبھی وہ جوشِ مسرت کبھی یہ شدتِ غم
ہر انقلابِ محبت میں ہے نیا عالم
نہ اَب وہ آہِ مسلسل نہ گریۂ پیہم
بَدل گئی ہے بہت روز سے طبیعتِ غم
تمام حُسن و محبت تمام کیف و اَلم
یہ رنگ بوُئے چمَن جلوۂ گل و شبنم
یہ انقلاب محبت ارے معاذ اللہ
نظامِ عالمِ ہستی بھی ہو گیا برہم
اک اَپنا غم ہی نہیں وجہِ اضطراب اے دوست
مری حیات کو ہے ساری کائنات کا غم

بہت دِنوں سے مری زندگی بھی ہے بےچین
بہت دِنوں سے ترا التفات بھی ہے کم
مری نظر میں ہے رقصاں نشاطِ مستقبل
میں دَورِ عشرتِ ماضی کا کیوں کروں ماتم
کوئی بتائے یہ کیا راز ہے! ازل سے ہی
جہانِ زیست میں ہے ایک شورشِ پیہم
تمہیں خبر ہے ہر اک بات کی مگر پھر بھی
مجھی سے پوچھتے ہو وجہِ دیدۂ پُرنم
یہ اور بات کہ رہتا ہوں کھویا کھویا سا
میں بے خبر تو نہیں تجھ سے اے نگاہِ کرم
میں رازدارِ جہانِ حیات ہوں مضطرؔ
مری نگاہ میں ہے زندگی کا ہر عالم

۱۹۴۸ء

۵

وہ دردِ زندگی و تلخیٔ حیات نہ پُوچھ
نہ پُوچھ مجھ سے محبت کے واردات نہ پُوچھ
دِل فسردہ کے پُردرد واقعات نہ پُوچھ
وہ قصۂ غم و آلام و حادثات نہ پُوچھ
فسانہ ہائے غمِ دِل نہ سُن خدا کے لئے
گذر چکے ہیں جو مجھ پر وہ حادثات نہ پُوچھ
اب امتیازِ نشاط و الَم رہا ہی نہیں
غَموں کی کونسی منزل میں ہے حیات نہ پُوچھ
ہر ایک سمت نظر آرہی ہے ظُلمتِ یاس
فسونِ تیرگیٔ شامِ کائنات نہ پُوچھ

جہاں پہ موت کی تاریکیاں ہیں چھائی ہوئی
کہاں گئی وہ جہاں تابیٔ حیات نہ پوچھ

میں اپنے رنج و مصائب سے خود نہیں واقف
مری حیات سے وجہِ غمِ حیات نہ پوچھ

میں کہہ سکوں گا نہ یہ داستانِ درد و الم
ترے فراق میں روتی ہے کیوں حیات نہ پوچھ

جہانِ زیست میں اک انتشار ہے پیہم
ارے ابھی سببِ شورشِ حیات نہ پوچھ

یہ زندگی ہے کہ احساسِ زندگی ہی نہیں
حیات آج ہے نامحرمِ حیات نہ پوچھ

یہ اضطراب کا عالم یہ دُکھ بھری دُنیا
سکوں کو بھول گئی کیوں مری حیات نہ پوچھ

حیاتِ عشق کی اس بے کسی کو کیا کہیے
کسی سے ٹوٹے ہیں کیسے تعلقات نہ پوچھ

نہ پوچھ حالِ غمِ ہجر پوچھنے والے
تڑپ تڑپ کے گذاری ہے میں نے رات، نہ پوچھ

اس انقلابِ مسلسل سے میری ہستی نے
لیا ہے کیسا اثرِ دَورِ کائنات نہ پوچھ

اُداس اُداس مناظر اُداس اُداس نگاہ
یہ صبحِ دہر ہے یا شامِ کائنات نہ پوچھ

میں کیا بتاؤں مجھے کچھ خبر نہیں اے دوست
نہ جانے کونسے عالم میں ہے حیات، نہ پوچھ

غمِ حیات کی ان وسعتوں میں اے مضطرؔ
نہ جانے کھوئی ہوئی ہے کہاں حیات نہ پوچھ

۱۹۴۹ء

۶

جلوۂ رنگ رنگ دیکھ جلوہ گہِ حیات میں
کیف بھی ہے الم بھی ہے دامنِ کائنات میں
اُس کو نظر نہ آ سکیں زیست کی بلندیاں
جس کی نظر اُلجھ گئی دامِ تعیّنات میں
آہ کوئی نہ سُن سکا زیست کی دُکھ بھری پُکار
دِل کی صدائیں دَب گئیں شورشِ کائنات میں
میری نظر سے اُٹھ گئے پردۂ فرق و امتیاز
عشق نہ رہ سکا اسیر دَہر کی رسمیات میں
شعلے سے اُٹھ رہے ہیں آج قلبِ زماں مکاں سے بھی
بھڑکی ہوئی ہے آگ سی سینۂ کائنات میں

جادۂ بیخودی بھی ہے منزلِ آگہی بھی ہے
عالمِ زندگی بھی ہے وسعتِ کائنات میں
اے مرے ہمسفر تجھے اس کی ابھی خبر نہیں
موت کی منزلیں بھی ہیں راہ غمِ حیات میں

۱۹۴۹ء

•

شعلۂ باثبات ہے سوزِ غمِ حیات ہے
درد کی کائنات ہے میرے دلِ گداز میں

۷

حیاتِ دہر میں رنگینیٔ حیات نہیں
یہ کائنات حقیقت میں کائنات نہیں

یہ آج پرسشِ غم کیوں بہ یک تبسمِ ناز
یہ التفات نہیں ہے یہ التفات نہیں

ابھی بھری ہوئی نظروں میں اُنس باقی ہے
ابھی ارادۂ ترکِ تعلقات نہیں

کسی کو دل سے بھلانے کی کوششیں معلوم!
یہاں سے آگے بس اب حدِ ممکنات نہیں

اُداس اُداس یہ منظر اُداس اُداس یہ شام
ترے بغیر محبت کی کچھ حیات نہیں

اسیر کر نہ سکیں گے مجھے زمان و مکاں
مری نگاہ بقیدِ تعیّنات نہیں

عجیب ایک مُعمّا ہے عالمِ ہستی
کہ بے ثبات بھی ہے اور بے ثبات نہیں

وہ ربطِ حسن و محبت کہاں وہ بات کہاں
یہ غم کی رات ہے مضطرؔ خوشی کی رات نہیں

۱۹۴۷ء

اَلم کا رنگ دیکھا ہے خوشی کا رنگ دیکھا ہے
نگاہِ زندگی نے زندگی کا رنگ دیکھا ہے
کلی کا رُوپ دیکھا ہے کلی کا رنگ دیکھا ہے
تری دوشیزگی و غنچگی کا رنگ دیکھا ہے
کہاں وہ دِل کشی اِن جلوہ ہائے لالہ و گُل میں
مری نظروں نے تیری سادگی کا رنگ دیکھا ہے
کسی کے التفات و بے رُخی کی بات کیا کہیے
کسی کے التفات و بے رُخی کا رنگ دیکھا ہے
سرِ محفل کسی کی خوش نگاہی دیکھنے والو
سرِ محفل کسی کی برہمی کا رنگ دیکھا ہے

کہاں موجِ نسیمِ صبح میں وہ سحر وہ جادو
چمن میں تیری آہستہ روی کا رنگ دیکھا ہے

بتاؤں کیا تمہیں اُس کے لبِ لعلیں کی رنگینی
گلِ تازہ کی نازک پنکھڑی کا رنگ دیکھا ہے؛

بہر پہلو سنبھالا ہے مجھے دردِ محبت نے
بہر انداز میری بے بسی کا رنگ دیکھا ہے

سکوتِ مستقل وہ رازِ اندر راز کا عالَم
محبت کی مسلسل خامشی کا رنگ دیکھا ہے

۱۹۵۱ء

۹

متاعِ دَرد سے محروم ہے حیات ابھی
بنی نہیں ہے محبت کی کائنات ابھی

یہ ترکِ جور و تغافل بجا مگر اے دوست
نہیں نگاہ میں پہلا سا التفات ابھی

ذرا ٹھہر کہ مری ڈبڈباتی آنکھوں کو
تری نگاہ سے کہنی ہے کوئی بات ابھی

میں اِس خموش اَدائے سپردگی کے نثار
ابھی سے خوفِ سحر کیا بہت ہے رات ابھی

ترے نثار دِل کشتۂ تغافل پر
ہوا نہیں اثرِ چشمِ التفات ابھی

بنا نہیں غمِ دنیا ابھی غمِ جاناں
غمِ حیات نہیں ہے غمِ حیات ابھی
ہوئی نہیں ہے ابھی انتہائے دردِ فراق
نہیں بھلاتے ہیں دل سے وہ واردات ابھی
میں تیری یاد سے غافل نہیں ابھی اے دوست
پکارتی ہے تجھے دکھ بھری حیات ابھی
ابھی نظر کو میسّر کہاں ترے جلوے
اُداس اُداس ہے سُونی ہے کائنات ابھی
ابھی کہاں مجھے احساسِ عشرتِ دُنیا
کہ تیرے غم میں ہے ڈوبی ہوئی حیات ابھی
ابھی کچھ اور تغافُل کر اے نگاہِ یار
نہیں ہے دِل کو تمنّائے التفات ابھی

قسم قسم تری معصومیٔ نگہ کی قسم
بڑھیں گے اور نظر کے توہمات ابھی
یہ اضطراب کہیں اور بھی نہ بڑھ جائے
کہ دل کو یاد کچھ آتے ہیں واقعات ابھی
الٰہی خیر کہیں رازِ غم نہ کھُل جائے
سکوتِ یاس نے چھیڑی ہے کوئی بات ابھی
غم و نشاط کی تاریک و تنگ راہوں میں
سکوں کو ڈھونڈ رہی ہے مری حیات ابھی
حیاتِ غم کا نہیں ہے ابھی کوئی عالم
نہ بے ثبات ابھی ہے نہ باثبات ابھی
ابھی کہاں ہے مکمل شعورِ آزادی
نگاہ و دل ہیں اسیرِ تعیّنات ابھی

ابھی ہیں شورشیں باقی فضائے عالم میں
کہ پُرسکون نہیں دَورِ کائنات ابھی
اک انقلاب کا اس درجہ غم نہ کر مضطؔر
کہ دیکھنے ہیں بہت سے تغیرات ابھی

۱۹۴۸ء

●

آج نفس نفس میں ہیں شعلۂ دردِ زندگی
دل میں بھڑک اٹھی ہے پھر آتشِ غم نواز کیا

۱۰

یہ التفاتِ مُسلسل یہ لُطف کا آغاز
ہر اک نگاہِ محبت ہے ایک عالمِ راز

ہے کاروانِ غمِ زندگی رواں پیہم
نگاہ میں ہیں رہِ وقت کے نشیب و فراز

اَرے یہ کس نے طلسمِ سکوت توڑ دیا
میں سن رہا تھا بڑی دیر سے تری آواز

دلِ فسردہ سنبھلنے دے مُسکرانے دے
کہ اُٹھ رہی ہے اِدھر وہ نگاہِ جلوہ طراز

یہ سَرد رات یہ دَورِ شراب و کیفِ وصال
یہ چشمِ مَست یہ زُلفیں سیاہ اور دَراز

یہ جاگتا ہوا جادو یہ مدھ بھری آنکھیں
یہ شوخیاں یہ تبسّم یہ ناز یہ انداز

یہ جام و ساغر و شعر و سرود و چنگ و رباب
صدائے مطربِ نوخیز و رقصِ شعلہ ساز

یہ سرخیٔ لب و رخسار یہ جبیں کی دمک
یہ تیرے حسن کی خود آگہی یہ عالمِ ناز

یہ رنگ و بُو کا تلاطم یہ گرمیٔ انفاس
کمر کی نرم لچک جسمِ مرمریں کا گداز

یہ بے خودی ہے کہ خوابِ حیات کا عالم
یہ سرخوشی ہے کہ کیفیتِ جہانِ مجاز

۱۹۵۱ء

۱۱

بیتاب ہے جہان بھی دِل بھی حیات بھی
کیا مطمئن کرے نگہِ التفات بھی

ارض و سما سے بڑھ کے ہیں اُس دِل کی وُسعتیں
جس میں سما گیا ہو غمِ کائنات بھی

کیوں بڑھ رہی ہے تیرگیٔ شامِ زندگی
دیکھا ہے میں نے جلوۂ صبحِ حیات بھی

غارت گرانِ امن کی سفاکیاں نہ پوچھ
لوٹی گئی متاعِ سکونِ حیات بھی

تاریکیوں میں قید ہے مستقبلِ وطن
بے نور سا ہے چہرۂ اہلِ حیات بھی

اے بے عمل تو واقفِ رازِ عمل نہیں
یہ زیست بے ثبات بھی ہے باثبات بھی

ہاں تیرے عشق میں دلِ اُمیدوار نے
کھاتے بہت فریبِ نشاطِ حیات بھی

پہونچا رہے ہو جب سے تم آسانیاں مجھے
کچھ اور بڑھ گئی ہیں مری مشکلات بھی

مضطرؔ نگاہِ دوست نے دنیائے عشق پر
کھولے ہیں راز ہائے حیات و ممات بھی

۱۹۴۸ء

۱۲

نقوشِ راہ بنتے جا رہے ہیں رہبرِ منزل
حیاتِ حال دیتی ہے پیامِ دورِ مستقبل
نظامِ دہر بدلا طور بدلے زندگی بدلی
نہ وہ رہرو نہ وہ راہیں نہ وہ جادہ نہ وہ منزل
جو تجھ سے ہو سکے تو زندگی کو زندگی کر لے
یہ ناداں! شکوۂ درد و الم کرنے سے کیا حاصل
مرے ذوقِ طلب کی وسعتوں کا واہ کیا کہنا
مرے آغوش میں خود ہی سمٹ کر آگیا ساحل
پتا تیرا نہ پانے تک تو تھی اک بیخودی لیکن
نہیں معلوم اب کس فکر میں کھویا ہوا ہے دل

شعورِ عشق بھی ہے اور احساسِ حوادث بھی
نہ تجھ سے بے خبر ہے دل نہ خود سے بے خبر ہے دل

جہاں کی منزلوں میں دہر کی تاریک راہوں میں
نہ جانے جستجو کس کی ہے کس کو ڈھونڈتا ہے دل

وہ انساں درحقیقت آشنائے رازِ ہستی ہے
نظر آتی ہے جس کو ہر قدم پر اک نئی منزل

ارے یہ جلوۂ منزل فریبِ حسنِ منزل ہے
اسی منزل میں لٹتی ہے متاعِ کاروانِ دل

ابھی پہنچی نہیں اس جا نگاہیں اہلِ عالم کی
جہاں رہتا نہیں کچھ امتیازِ ناقص و کامل

اندھیری رات کی خاموش تنہائی میں اے مضطر
کسی کو یاد کر کے چپکے چپکے رو رہا ہے دل

۱۹۴۸ء

قدم قدم پہ ہزاروں ہیں مشکلات مجھے
ملی نہیں ہے ابھی منزلِ حیات مجھے
وسیع کرنا ہے اب دامنِ حیات مجھے
سمیٹنی ہے ترے غم کی کائنات مجھے
نشاطِ عہدِ محبت کی زندگی کی قسم
بہت نہیں غمِ ترکِ تعلقات مجھے
ہر ایک گوشے میں دنیائے حسن ہے آباد
نہیں ہے کم یہ جمالِ تعینات مجھے
اسی حیات کی اس بے ثبات دنیا میں
تلاش کرنا ہے اک عالمِ ثبات مجھے

کلی کے چہرے پہ رونق نہ روئے گل پہ نکھار
کہ شامِ زیست ہے یہ صبحِ کائنات مجھے
مری نظر نے تغافل کا رنگ دیکھا ہے
بس اب فریب نہ دے چشمِ التفات مجھے
کچھ اِس طرح سے اِدھر گھورتی رہی وہ نگاہ
کہ جیسے یاد دِلاتی ہو کوئی بات مجھے
ابھی تو مجھ کو بہت سے ہیں کام دُنیا میں
ابھی بہت ہے یہاں فرصتِ حیات مجھے
ابھی نہ جانے دِکھائیں نشاط و غم کیا کیا
یہ زندگی کے مسلسل تغیّرات مجھے
وہ صبح تو نہیں نظر آ رہے ہیں اے مضطر
ہزار جلوۂ مستقبلِ حیات مجھے

۱۹۴۸ء

۱۴

جب اُس نظر کی کوئی بات یاد آتی ہے
نگاہ گہرے خیالوں میں ڈُوب جاتی ہے
کچھ اِس طرح سے تری دل کو یاد آتی ہے
چمن میں تیز ہوا جیسے سنسناتی ہے
تری نگاہ کچھ اس طرح مُسکراتی ہے
کہ دِل کو یادِ غمِ ہجر آہی جاتی ہے
مری حیات کی بے چینیاں بڑھاتی ہے
تری نگاہ محبت کو آزماتی ہے
حیات ہجر میں تیرے وہ راگ گاتی ہے
اجل بھی سُن کے جسے جُھوم جُھوم جاتی ہے

ترے کرم سے مری کاوشِ مسلسل سے
غمِ حیات کی تکمیل ہوتی جاتی ہے
یہ انقلاب ہے اک تازہ زندگی کا پیام
نئے جہان کی تنظیم ہوتی جاتی ہے
یہ کس مقام سے آتی ہے خوفناک آواز
کہ کائنات کی ہر چیز تھرتھراتی ہے
قدم قدم پہ جہاں کی اندھیری راہوں میں
تری نگاہ مجھے روشنی دکھاتی ہے
یہ کس کے رُخِ جہاں تاب کی شعاعیں ہیں
کہ رات صبح کے مانند جگمگاتی ہے
یہ نرم نرم فضائیں یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں
یہ رات جیسے کوئی داستاں سناتی ہے

کچھ اس طرح کی ترے انگ انگ میں ہے لچک
فضائے صبحِ چمن جیسے رسمساتی ہے
اندھیری رات کی تنہائیوں میں اے مضطرؔ
کسی کی یاد مجھے دیر تک رُلاتی ہے

۱۹۴۸ء

●

پھر آج دل پہ اُبھرنے لگے نقوشِ حیات
پھر آج قدرِ متاعِ حیات ہونے لگی

۱۵

فکرِ نشاطِ مُستقل ایک اُمیدِ خام ہے
کتنی حسین صبح تھی کتنی اُداس شام ہے

لحظہ بہ لحظہ اضطراب لمحہ بہ لمحہ انقلاب
کاوشِ زندگی ہنوز مقصدِ ناتمام ہے

آہ یہ راہِ خَم بہ خَم اور یہ فکرِ بیش و کم
حسن بھی زیرِ دام ہے عشق بھی زیرِ دام ہے

آہ یہ دَورِ کشمکش اور یہ مشکلِ جہاں
گردشِ روزگار ہی گردشِ صبح و شام ہے

آہ یہ حلقۂ ہَوس صرف برائے یک نفَس
زیست کا انتظام بھی موت کا اہتمام ہے

۱۹۵۱ء

۱۶

میری نظر میں حدِ نظر تک حیات ہے
اے دل بہت وسیع مری کائنات ہے

پھر میرے حال پر نگہِ التفات ہے
اب کیا کروں کہ غم بھی مرا بے ثبات ہے

محروم ہے جو تیری محبت کے درد سے
اے دوست وہ حیات بھی کوئی حیات ہے

اک عمرِ غم کے بعد تو ہو مائلِ کرم
وہ اک نگاہ حاصلِ صد التفات ہے

مضطرؔ مجھی سے حسن و محبت کو ہے فروغ
میری حیات آئینۂ کائنات ہے

۱۹۴۶ء

۱۷

حُسن کی تجلّی سے رُوح میں چراغاں ہے
زندگی غزلخواں ہے کائنات رقصاں ہے
بے خودی کا عالَم ہے جلوۂ بہاراں ہے
آرزوئے نظّارہ گلِستاں بداماں ہے
اک غمِ مسلسل ہے دردِ زیست کا احساس
زندگی کے ہاتھوں خود زندگی پریشاں ہے
دَہر کے تغیّر نے ہر مزاج کو بدلا
بے رُخیٔ جاناں بھی انقلابِ دوراں ہے
وقت کی نگاہوں میں سُرخ سُرخ شعلے ہیں
اور جہاں کے سینے میں حشر خیز طوفاں ہے

صبح دیر میں ہوگی ہے ابھی اندھیری رات

آفتابِ مستقبل ظلمتوں میں پنہاں ہے

سعی زندہ رہنے کی کر رہے ہیں اہلِ دِل

اور تو زمانے کی کشمکش سے حیراں ہے

بادۂ محبت ہے اہلِ دل کے ساغر میں

زندگی کے ہاتھوں میں زندگی کا ساماں ہے

دیکھ! وہ نظر آتی منزلِ حیاتِ نَو

رنگ و نور سے بھرپور آج اپنا داماں ہے

سارے سارے دن آہیں رات رات بھر آنسو

شام تک اندھیرا ہے صبح تک چراغاں ہے

ہر طرف ہی طاری ہے موت کا سا سنّاٹا

محفلیں بھی سُونی ہیں زندگی بھی ویراں ہے

یہ تغافلِ ساقی یہ تجاہلِ رنداں
میکدے کا شیرازہ کس قدر پریشاں ہے

حال سے خدا غافل اور ناخدا بے ہوش
کشتیٔ حیاتِ قوم درمیانِ طوفاں ہے

ایک کھیل ہے گویا یہ نئی سیاست بھی
جیتنے کی کوشش بھی ہارنے کا امکاں ہے

التفات کی اُن سے کیا اُمید اب اے دِل
اُن کا حُسنِ بے پروا عشق سے گریزاں ہے

اپنی بے گُناہی پر اپنی کم نِگاہی پر
عشق بھی ہے شرمندہ حُسن بھی پشیماں ہے

عشق ہی نہیں تو پھر کیا مزا ہے اے مضطرؔ
آگ ہے نہ پانی ہے درد ہے نہ درماں ہے

۱۹۵۱ء

صبح میں دیر ہے باقی ہے بہت رات ابھی
عالمِ نور ہے دَر پردۂ ظلمات ابھی
ہمنشیں! چشمِ زمانہ نے اٹھائے ہی نہیں
چہرۂ حال سے ماضی کے حجابات ابھی
ابھی محکم ہی نہیں ہے یہ نظامِ ہستی
ہاں! بدلنی ہے بہت صورتِ حالات ابھی
حال کے دیدۂ اُمید کو پہنچانے ہیں
اپنے مستقبلِ زرّیں کے پیامات ابھی
کیف و عشرت کی قسم صبحِ مسرّت کی قسم
کون سُنتا ہے شبِ غم کی حکایات ابھی

قافلے اہلِ محبت کے گئے کب کے مگر
مٹ نہیں پائے یہ دھندلے سے نشانات ابھی

ہاں! نہیں سمجھے ہیں میرے دلِ معصوم نے دوست
تیری دزدیدہ نگاہوں کے اشارات ابھی

روک رکھا ہے انھیں سوچ رہا ہوں جیسے
یاد آتی ہو مجھے اور کوئی بات ابھی

ہر نظر آئینۂ عالمِ نو ہے مضطرؔ
جانے کتنے ہیں تخیل کے مقامات ابھی

۱۹۴۹ء

۱۹

محرمِ راز بھی ہے واقفِ حالات بھی ہے
وہ نظر آئینۂ عالمِ جذبات بھی ہے

یہ بھی سچ ہے کہ مجھے فکرِ تمنّا بھی نہیں
پھر یہ بھی سچ ہے کہ مجھے حسرتِ مافات بھی ہے

وہ کرے ترکِ تغافل مرے کہنے سے تو کیا
خود ہی احساس اُسے ہو تو کوئی بات بھی ہے

تو نہ سمجھے تو تکلّم بھی ہے مبہم اے دل
تو سمجھ جائے تو مفہومِ اشارات بھی ہے

انقلاباتِ زمانہ کے مؤرّخ یہ بتا!
تجھ کو اندازۂ خونریزیٔ حالات بھی ہے

دل تو صدمات جہاں کا متحمّل ہے مگر
لب پہ کچھ شکوۂ دردو غم و آفات بھی ہے
غمِ فردا تو نہ بن جائے نشاطِ امروز
مجھ کو اندیشۂ بے رنگیٔ حالات بھی ہے
نگہِ دوست تری دردشناسی کے نثار
واقعی دل مرا لبریزِ شکایات بھی ہے
عشق کے جور و ستم دل نہیں بھولا ہے ابھی
یاد وہ قصّۂ الطاف و عنایات بھی ہے
عشق کا ذوقِ نظارا تو نہیں ہے پابند
مانتا ہوں کہ یہاں قیدِ مقامات بھی ہے
تیری دُنیا میں غمِ دہر کے ماروں کے سوا
رنج سہنے کے لئے ایک مری ذات بھی ہے

۱۹۴۹ء

۲۰

اسی میں کیفِ زیست بھی ہے دردِ کائنات بھی
بھرا ہُوا ہے دولتوں سے دامنِ حیات بھی

نظر نظر میں گھُل رہا ہے نشۂ حیات بھی
نفس نفس میں شعلہ زن ہے دردِ کائنات بھی

یہ دیکھیے کہ انقلابِ عالمِ حیات سے
بدل گیا نظامِ زندگیٔ کائنات بھی

ہر انقلابِ زندگی نئے ہوئے ہے زندگی
حیات کا پیام ہے تغیرِ حیات بھی

مرے سرورِ زندگی کی وسعتیں تو دیکھیے
سمٹ کے آگیا اِن میں دردِ کائنات بھی

یہ کس کے حسنِ زندگی فروز کی ہیں تابشیں
کہ جگمگا رہی ہے آج محفلِ حیات بھی
مچل رہے ہیں کس کے لب پہ نغمہ ہائے زندگی
کہ رقص کر رہی ہے آج روحِ کائنات بھی
کبھی خوشی کبھی الم کبھی ستم کبھی کرم
عجیب ہیں یہ دورِ عشق کے تغیرات بھی
پیام کیفِ وصل لائے گی شعاعِ صبحِ نو
مٹے گا دردِ ہجر بھی کٹے گی غم کی رات بھی
زماں مکاں کی قید میں رہی نہ میری زندگی
مری نظر نے توڑ دی حدِ تعینات بھی
نہ جانے آج زندگی کے کتنے راز کھل گئے
کہاں کہاں پہنچ گئے مرے تخیلات بھی

۱۹۴۸ء

۲۱

رازدارِ غمِ حیات ہوں میں
محرمِ دردِ کائنات ہوں میں
نور ہے جس کا قصرِ منزل تک
وہ چراغِ رہِ حیات ہوں میں
جن کے قبضے میں ہیں حیات و ممات
اُن نگاہوں کی کائنات ہوں میں
جس کی ہر اک نظر میں ہیں سو حسن
ہاں اُسی عشق کی حیات ہوں میں
رُوح سُن کر جسے تڑپ اُٹھے
وہ نوائے غمِ حیات ہوں میں

مجھ کو دم بھر سکوں نہیں ملتا
ہائے کس درد کی حیات ہوں میں
سلسلہ ختم ہی نہیں میرا
کاروانِ غمِ حیات ہوں میں
میری ہستی ہے ہستئ جاوید
کیسے کہدوں کہ بے ثبات ہوں میں
حسنِ معصومئ حیات ہے تو
عشقِ معصومئ حیات ہوں میں
غم کا آغوش مجھ پہ ہے آباد
مسکراتی ہوئی حیات ہوں میں
ذرہ ذرہ ہے گوش بر آواز
نغمۂ سازِ کائنات ہوں میں

۱۹۴۸ء